

مرزا عصمت اللہ پیرک



مذہب و وقت

مرتب: وقار خلیل

عصمت اللہ پیرک پبلشرز، لاہور

متاعِ ظرافت

مضامین مرزا عصمت الشبکی رحمہ

ترتیب وفار خلیل

جملہ حقوق بحق عصمت میموریل پبلی کیشنز کمیٹی محفوظ

اشاعت اول: فروری ۱۹۸۵ء (تعداد: ۵۰۰)

کتابت: عقیل الرحمن

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارمینار حیدرآباد

سرورق: غوث محمد

قیمت: پندرہ (۱۵) روپے

ناشر: عصمت میموریل پبلی کیشنز کمیٹی

۱۰/۳۴۸-۲-۱۵، آصف نگر، حیدرآباد ۲۸۰۰۰۵

بہ اعانت

ایچ۔ای۔ایچ۔ ڈی نظامس اردو ٹرسٹ، ادبی ٹرسٹ حیدرآباد
اردو کمیٹی آنڈر اپریش حیدرآباد

ملنے کے چھ:

○ وفار خلیل معرفت ایوان اردو، پنجم گٹھ، روڈ، حیدرآباد

○ دفتر نیوز ٹرسٹ آف انڈیا، مکرم جی، روڈ، حیدرآباد

○ حسامی بک ڈپو، پچھلی کمان، حیدرآباد

○ الیاس ٹریڈرس شاہ علی بندہ روڈ، حیدرآباد

○ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دھلی / بمبئی / علی گڑھ

ترتیب

۴	نواب طاہر علی خاں	پیش لفظ
۸	جناب فضل الرحمن	یاد عصمت
۱۳	جناب مصطفیٰ شروانی	عرض حال
۱۶	جناب خواجہ محی الدین	تاثرات
۱۷	مرزا عصمت اللہ بیگ	مکید
۱۹	" " " "	ظرافت کیا ہے؟
۲۱	" " " "	حاضر جوابی
۹۹	" " " "	عربوں کی ظرافت
	پرانے ناک	
۱۲۳	مرزا عصمت اللہ بیگ	اندر سمجھنے پہلے اور بعد
	ادبی خاکے	
۱۳۹	مرزا عصمت اللہ بیگ	معشوق علی خاں جوہر
۱۶۹	" " " "	عظمت اللہ خاں مرحوم
۱۸۰	" " " "	فرحت کی زندگی کے چند پہلو
۲۰۷	" " " "	سجاد مرزا
۲۲۲	ڈاکٹر زینت ساجدہ	تاثرات
۲۲۳	جناب الیں اے شکور	
۱۲۷	وقار خلیل	حرف آخر

پیش لفظ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مزاح نگار قوم کا معمار ہوتا ہے جو اپنے مزاحیہ مضامین اور تحریروں کے ذریعہ قوم کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں ایک خاموش انقلاب لاتا ہے۔ مزاح نگار کے زورِ قلم کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہوتی۔! وہ ایک طوفان کی طرح قومی زندگی میں تلاطم برپا کرتا ہے، محفلِ غم کو بزمِ مسرت میں بدلنا اس کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہوتا ہے۔ وہ قوم کا نبض شناس ہوتا ہے اور فطرتِ انسانی کا کوئی گوشہ اس کے فہم و ادراک کی رسائی سے باہر نہیں۔

مزاح نگاری ایک مشکل اور نازک فن ہے، فطری رجحان نفسیاتی مطالعہ، بے باکی، بے ساختگی، نکتہ رسی، زبانِ دانی اور برجستگی، مزاحیہ نگاری کے لوازمات میں داخل ہیں، جس کے بغیر کوئی مزاح نویس، اوجِ ترقی پر نہیں پہنچ سکتا، جس مزاح نگار ادیب میں یہ خوبیاں نہیں ہوتیں اس کی تحریر اور طرزِ نگارش میں لطافت نہیں ہوتی۔ بناوٹ اور آرد کا پہلو اس طرح نمایاں ہوتا ہے

کہ ان کی ظرافت بارگراں بن جاتی ہے، اگرچہ اردو زبان کے ہر دور میں مزاح لکھنے والوں کی قابلِ لحاظ کمی رہی ہے، پھر بھی یہ کہنا حقیقت سے دور نہیں کہ سرزمینِ ہند نے کئی ایسے بلند پایہ مزاح نگار ادیب پیدا کئے جن کے بیش بہا خدمات کی بدولت ہندوستان کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں نمایاں اصلاح و ترقی ہوئی، جن پر اردو ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، میرزا مجتبیٰ ستم ظریف، احمد علی شوق، محمد حسین آزاد، بابو جواہر پرشاد برقی اور اکبر الہ آبادی قابلِ ذکر ہیں جن کو صفِ اول کے مزاح نگاروں میں گنا جاتا ہے۔ ان صاحبانِ کمال نے اس زمانے میں جب فرنگی تہذیب کی بدولت ہندوستانی سماج، معاشرت اور اخلاق میں طرح، طرح کی بُرائیاں پیدا ہوتی جا رہی تھیں اپنے مزاحیہ مضامین اور طنزیہ نظموں کے ذریعہ قوم کے سوے ہوئے شعور کو بھنبھورٹا اور اس پستی کا احساس دلایا، جس میں وہ دھنسنے جا رہے تھے۔

اردو ادب کے پچھلے چار دھوں میں فنِ مزاحیہ نگاری کو ترقی کی اونچی منزلوں پر پہنچانے اور اس کو نئی صورت گری عطا کرنے میں میرزا فرحت اللہ بیگ، پروفیسر رشید احمد صدیقی، میرزا عظیم بیگ چغتائی، سندباد جہازی، ایم اسلم، شوکت تھانوی، ملا رموزی، کنہیا لال کپور، احمد شاہ پطرس، بخاری اور میرزا عصمت اللہ

بیگ نے نمایاں حصہ لیا۔

مرزا عصمت اللہ بیگ بحیثیت مزاح نگار ادیب و شاعر ادبی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

عصمت اللہ بیگ ۲۲ مارچ ۱۸۹۹ء کو دہلی کے ایک شریف خاندان میں پیدا ہوئے، کم عمری میں حیدرآباد آئے۔ تعلیم و تربیت اور ملازمت کا زمانہ حیدرآباد ہی میں گزرا، میرزا صاحب خلیق، سنجیدہ اور شگفتہ مزاج تھے، جس کی وجہ سے حیدرآباد کے علمی، ادبی طبقے میں ہر دل عزیز اور مقبول خاص و عام رہے، جس محفل میں جاتے وہ رونق محفل بن جاتے، طنز و مزاح آپ کی فطرت میں داخل تھا، ان کا مزاحیہ کلام ہو یا کہ مزاحیہ مضمون جہان دلچسپی کا سامان پیدا کرتا ہے وہیں طنز کی ہلکی ہلکی چٹکیاں بھی لیتا ہے۔

مزاح نگاری اور طنزیہ شاعری مرزا صاحب کا نمایاں وصف رہا ہے، سنجیدہ مضامین کو مزاح کے پیرایہ میں اس خوبی سے ادا کرتے کہ لطافت اور شگفتگی کے پہلو میں کوئی فرق نہیں آتا۔ میرزا صاحب کی مزاح نگاری کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی ظرافت اخلاقی معیار سے کبھی گرنے نہیں پاتی اور پختہ تعمیری اور اصلاحی مقصد پیش نظر رہا۔

میرزا صاحب کے ادبی کارنامے ہندوستان اور حیدرآباد کی

ادبی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں آپ کو بحیثیت مزاح نگار شاعر، مدیر اور ڈرامہ نویس امتیازی شہرت حاصل ہے۔ انھوں نے بے شمار مضامین اور انگنت نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں جن سے آپ کی ذہانت، ہمارت اور کمالِ فن کا اظہار ہوتا ہے۔

عصمت اللہ بیگ اگرچہ صرف اردو کے ادیب تھے لیکن دوسری زبان والے بھی ان کی علمی خدمات سے بخوبی واقف ہیں۔ میرزا صاحب حیدر آباد کے ان ادیبوں میں سے تھے، جو ریڈیو رسالوں اخباروں اور ادبی جلسوں میں اپنے مضامین کی وجہ سے ادبی دنیا میں مقبول اور طنز و مزاح کی چاشنی سے عوام کے محبوب ادیب بن گئے تھے۔ بہر حال مرزا عصمت اللہ بیگ حیدر آباد کی ادبی محفلوں کے روح رواں رہے۔ وہ اپنے ادبی کارناموں کی وجہ سے آج بھی زندہ ہیں میرے خیال میں ان کی یاد کو تازہ رکھنے میں اس سے بہتر بات اور کوئی نہیں ہے کہ ان کی غیر مطبوعہ تحریروں اور تصانیف کو زیور طباعت سے آراستہ کیا جائے۔

مجھے اُمید ہے کہ ہمارے ملک کے ممتاز ادیب مرزا عصمت اللہ بیگ کے اس مجموعہ مضامین یعنی ”متاعِ ظرافت“ کا اہل علم اور صاحبِ ذوق حضرات پوری دلچسپی سے مطالعہ کریں گے۔

نواب طاہر علی خان
صدر نشین اقلیتی کانگریس

یکم جنوری ۱۹۸۵ء
علی کاٹیج، حیدر آباد۔

یادِ عصمت

فضل الرحمن سابق پروائیں چائسلر مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

مرزا عصمت اللہ بیگ جنہیں اہل حیدر آباد عصمت اور اہل دہلی عصمت اور بقول ان کے بعض لندن پلٹ دوست اس مستحکم کہا کرتے تھے اردو کے ان زندہ دل ادیبوں میں سے تھے جن کی شرکت کے بغیر کوئی مشاعرہ ادبی محفل اور خانگی صحبت پُر لطف نہیں ہو سکتی تھی۔ شاعروں میں جب وہ اپنی مزاحم نظموں سناتے یا جلسوں میں طریفانہ تقریریں کرتے، خانگی صحبتوں میں ہنسی مذاق سے فخرے کتے تو اہل مجلس ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے اخبار اور ریڈیو پر بھی ان کے مضامین کا یہی رنگ ہوتا تھا۔ وہ ہر بات میں مذاق کا پہلو نکال لیتے تھے۔ ہر چیز انہیں مضحکہ نظر آتی تھی۔ میں ان سے ۱۹۱۷ء میں پہلی بار ملا تھا جب ہم سب چادر گھاٹ ہائی اسکول میں پڑھتے تھے۔ اردو آل سنٹس اسکول سے دورے دورے ہمارے مدرسہ کو چلے آتے اور ہم سے کچھ شپ لڑاتے تھے۔ پڑھائی کا انہیں کبھی بھی شوق نہیں رہا البتہ کھنے کا بیک شوق تھا سب سے پہلی ملاقات میں انھوں نے اپنی تانہ تصنیف ”اجیر کا سفر“ سنائی یہ ایک بیوقوف مولوی صاحب کا سفر نامہ تھا۔ جس میں عجیب و غریب حاکمیتیں اور مزے مزے کی حکایتیں درج تھیں ہمارے ہنسی کے ہم سب طالب علموں کی جاق نکلی جا رہی تھی اور وہ بہت ہی سنجیدہ صورت بنائے پڑھے جا رہے تھے پھر اس کے بعد کچھ اپنے مدرسے کے یلغارے ملنے لگے کہ

کس طرح استادوں کی آنکھ بچا کر سگریٹ کے کش لگائے جاتے تھے۔ کلاس سے غائب ہو کر کلاس کا حاضری ڈھونڈنے کے کون سے طریقے کار گر ہو سکتے ہیں اپنی شرارتیں دوسروں کے سر کس طرح تھوپا جاسکتی ہیں وغیرہ

اس دور سے پچھلے سال تک پورے ۳۰ برس ہوئے ہیں۔ اس طویل مدت میں زمانے نے کیسے کیسے رنگ بدلتے پہلی بڑی لڑائی ختم ہوئی۔ ہندوستان بیدار ہوا۔ قومی تحریک سارے ملک میں پھیل گئی۔ ترک موالات اور سیول نافرمانی کے سلسلے میں لاکھوں اہل وطن نے قربانیاں دیں۔ اصلاحات ہوئے وزارتیں بنیں اور ٹوٹیں معاشی بحران آئے۔ دوسری بڑی لڑائی چھڑی، بنگال کا قحط پڑا۔ نازی اور ناسٹلی نظام فنا ہو گیا۔ ہندوستان کو آزادی ملی۔ خانہ جنگی میں لاکھوں گھرتباہ ہوئے ان انقلابات کا سب پر اثر پڑا کوئی ان کی زد سے بچ نہیں سکتا تھا ہر شخص اپنی اپنی طبیعت کے مطابق ان عہد آفریں تبدیلیوں کے بارے میں سوچتا اور رائے دیتا تھا۔ ان حادثات زمانے کے علاوہ ہر فرد کی زندگی میں بھی کچھ خانگی مشکلات پیش آتی ہیں۔ کچھ بیماریاں، کچھ تنگدستی کچھ لڑائی جھگڑے کچھ بد مزگیاں جن سے لوگ پریشان ہو جاتے ہیں اور زندگی سے زندہ دل انسان کا دل بھی بچھ جاتا ہے مگر ایک عظمت اللہ بیگ مرحوم تھے کہ دنیا کے بڑے سے بڑے حادثہ خانگی زندگی کی کٹھن سے کٹھن سے عیس۔ سہ کاری ملازمت کے مشکل سے مشکل مرحلے ان کی ہونٹوں سے مسکراہٹ نہ چھین سکے وہ ہر مصیبت کو اپنی شگفتہ طبیعت کے سانچے میں ڈھال کر ایک مزیدار لطیفہ بنا دیتے تھے جسے سن کر بے اختیار ہنسی آ جاتی تھی ان کا دل، حقنا زیادہ جلتا تھا اتنا ہی ان کا دماغ روشن ہو جاتا تھا اور پھر اس روشنی میں ظرافت کے رنگا رنگ پھول کھلتے تھے میں نے ان کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔

اور ہر تقریب ملا ان کی باتیں سنیں ہیں۔ خوشی کے موقعوں پر غم کی مجلسوں میں علمی جلسوں کے پلیٹ فارم پر ڈراما کے اسٹیج اور ریڈیو کے اسٹوڈیو میں بے تکلف صحبتیں ہوں یا رسمی تعاریف، دوست احباب کے چمکھٹے ہوں یا پبلک کے مجمع کوئی موزون ہو کوئی مسئلہ کبھی سنجیدہ گفتگو کرنا نہیں دیتے تھے ہمیشہ کوئی نہ کوئی طرافت کا پہلو نکال لیتے تھے۔

جن لوگوں نے عصمت کی نظیں سنی ہیں یا ان کے مضامین پڑھے ہیں وہ اس امر کی گواہی دیں گے کہ مزاحیہ نگاری ان کی فطرت میں داخل تھی وہ جانتے بھی تو اس کوچہ سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے تھے پچھلے تیس سال سے ان کی متعدد نظیں اور مضامین پڑھنے اور سننے میں آئے ہیں جو سب کے سب پاکیزہ مذاق کے نمونے ہیں۔ ریڈیو پر وہ کئی برس تک سننے والوں کی تفریح طبع کا سماں جہاں کر چکے ہیں۔ اداکاری میں بھی انھیں کمال حاصل تھا خانگی صحبتوں اور کئی برس پہلے اسٹیج پر وہ ایکٹنگ کے جوہر دکھا چکے ہیں یہ سب کچھ تو ہوا لیکن میں پھر بھی کہوں گا کہ ان کے شام کارنامے یکجا کیے جائیں اور یہ سب بڑے قابل فخر کارنامے تھے تو بھی وہ ان کی روزمرہ گفتگو کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مزاحیہ مضمون لکھنے والے اور بھی ہیں نظم میں طرافت کی چاشنی دوسروں نے بھی دی ہے اردو کو میڈیا میں کچھ ڈراما نویس اللہ سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں لیکن میری دانست میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے تمام عمر صبح سے شام تک اپنے ساتھیوں کو یوں لگاتار ہنسایا ہو یہ مبالغہ نہیں یہ امر واقعہ ہے ڈاکٹر جانسن کی طرح اگر انھیں کوئی بوز دیلا ملتا تو ان لطیفوں سے کئی جلدیں تصنیف ہو سکتی تھیں جنہیں وہ ہر موقع پر گھر لیتے تھے۔

اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سارا وقت صرف وہی نقرہ بازی کیا کرتے تھے اور ہم سب بیٹھے ہوئے ان کے نعروں کی داد دیتے تھے سچ تو یہ ہے کہ احباب کا ایک ایسا حلقہ بن گیا تھا جس میں کئی ایک خوش طبع ہر وقت ہنستے ہنساتے بیٹھے

موجود رہتے تھے میں اور میرے بھائی عطاء الرحمن ہمارے دوست ابو ظفر اور بے
گوپال چادر گھاٹ ہائی اسکول کے ان طالب علموں میں سے تھے جو عصمت کا ادب نوازی
اور نغمہ طرازی کی محفلوں میں دن رات شریک رہتے اور گفتگو میں برابر کی چوٹیں
کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی تو ضلع جگتا کہ ایسی بھرمار ہوتا کہ معلوم ہوتا کہ لفظی جنگ
ہو رہی ہے مگر وہ سب شوخی اور شرارت پر غلوں دستی میں کسی قسم کا تفرقہ نہ ڈال سکتی تھی
بچپن ہی سے میں ڈرامے دیکھنے اور ڈرامے اسٹیج کرنے کا چسکا لگ گیا تھا۔
شہر میں انفلونزا کا وبا پھوٹ پڑی تھی، ہر طرف کھانسی بخار کا رونا تھا مگر ہم،
برابر جوری چھبے گھروں کی دیواریں پھانڈ کر تھیسر دیکھنے چلے جاتے تھے اور صبح
سویرے سسنان گلیوں کی گندی ہوا کھاتے ہوئے گھر لوٹتے تھے یا پھر ڈراما
کے رپہر سل کیلئے آدھی آدھی رات تک جاگتے اور آغا حشر کے گردار مکالموں
سے محلے والوں کا نعیدیں حرام کر دیتے تھے یہ سب کچھ ہوتا لیکن نہ ہمارے
والد صاحب کو اور نہ عصمت کے چچا آبا کو اس کی کانوں کا نا خبر ہونے باقی ان
بزرگوں کو یہی یاد کرایا جاتا کہ لڑکے وعظ کی محفلیں نہ گئے ہوئے ہیں لیکن ایک
دفعہ ایسا ہوا کہ بلط عام کے ٹاؤن ہال میں جہاں ہم ”صید ہوس“ کا کھیل دکھا رہے
تھے اور ہزاروں تماش بین عصمت کا مزاحیہ اداکاری پر تالیالابیٹ رہے تھے، سچ سین
میں سے جیکہ تھیسر میں تہقہوں کے طوفان اٹھ رہے تھے وہ بھلے ہوئے اندر
آگئے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے چچا آبا حاضر ہیں میں تشریف رکھتے ہیں اور اب گھر جانے
کے بعد خوب کچھ مرتکبے گا۔

اسکول سے نکلی کر ہم نے کالج میں قدم رکھا تو عصمت ملازمت میں
داخل ہو گئے ایک ادیب اور آرٹسٹ کیلئے انجینئرنگ کا محکمہ کس قدر عوزوں
ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں وہ کیسے انجینئر تھے اس کا تو کسی

کو علم نہ ہو سکا، لیکن احباب میں یہ مشہور تھا کہ جہاں کوئی شرک ٹوٹے یا پلے
 گرے یا کوئی عمارت ڈھ جائے تو سمجھ لو وہ عصمت کی بنیادی ہوئی ہے اس حسنِ ظن
 کی داد سب سے زیادہ وہ خوب دیتے تھے فنِ تعمیر سے متعلق کئی نظمیں اور مضمون
 لکھنے کے بعد انھوں نے اس پیشہ کو ہمیشہ کیلئے ترک کر دیا۔ پھر وہ جیل سے متعلق
 سرکاری پریس میں نوکر ہوئے اس زمانہ کو اپنی جیل کا زندگیاں سے تعمیر کیا کرتے تھے جب
 کبھی وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر قیدیوں کے وارڈ میں نکلتے تو ان بے نصیبوں کے چہرے
 پر ایسی مسکراہٹ کھیلنے لگتی کہ دیکھنے والے خیال کریں کہ شاید یہاں کا حکم ملا گیا ہے۔
 ملازمت کے آخری چند سال انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں
 گزارے اس زمانہ میں ان کی ادبی سرگرمیاں بہت زیادہ ہو گئی تھیں، لطیف
 کہانیاں، نظمیں، نپچس، خاکے، مضامین، نشری تقریریں، غرض،
 تصانیف کا تانتا بندھ گیا تھا، دن رات کی اس عرق ریزی سے ان کی صحت
 گر گئی تھی اور اب وہ اپنی بیماری اور موت کا مذاق اڑانے لگے تھے مرنے
 سے کچھ پہلے انھوں نے ایک مزاحیہ رسالہ جاری کیا اور اسی کام نے ان کا
 کام تمام کر دیا۔ اگر مجھ سے ان کے مزار کا کتبہ لکھنے کیلئے فرمائش کی جائے تو میں یہ عبارت
 جوینہ کروں گا۔

”وہ ہنستے ہوئے دنیا میں آئے، ہنستے ہوئے دنیا میں رہے اور
 ہنستے ہوئے دنیا سے چلے گئے“

(۳۰ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

عرضِ حال

کئی رات 'حرف و حکایات' میں
 سحر ہو گئی، بات ہی بات میں
 شہنوی "سحر البیان" میں میر حسن نے یہ شعر ایسا محسوس ہوتا
 ہے کہ آج کے اردو کے ماحول کے مطابق کہا ہے۔ اس زبان سے وابستہ
 افراد نے محسوس کیا کہ اردو کا مقام کس قدر پست ہو گیا ہے لیکن اب
 امید کی کرن نظر آنے لگی ہے۔

ادب میں میرزا عصمت اللہ بیگ کا ایک خاص مقام رہا ہے
 دلی گو جن اردو کے فن کاروں پر ناز رہا ہے ان میں میرزا عصمت اللہ
 بیگ ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

آج سے تقریباً ۲۰ سال پہلے کی بات ہے یعنی ۱۹۵۵ء کو
 جب اہل حیدرآباد نے ہمارے مشہور مزاحیہ ادیب میرزا عصمت اللہ
 بیگ کی ادبی اور علمی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا تو اس عظیم الشان
 یادگاری جلسہ میں ایک یادگاری کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا مقصد یہ تھا
 کہ میرزا صاحب کی غیر مطبوعہ تصانیف، نظم و نثر کو چھپوا کر عوام کے

سامنے پیش کرے اور یہ گزشتہ چھینے کی بات ہے کہ جب اس کی تشکیل جدید عمل میں لائی گئی تو عصمت میموریل پبلی کیشن کمیٹی کی صدارت مجھ ناچیز کو سپرد کی گئی اور اس کے سرپرست اعلیٰ ہماری ریاست کی ہر دل عزیز تہذیبی اور ثقافتی شخصیت محترم نواب طاہر علی خاں صاحب مغترب ہوئے۔

خوشی کی بات ہے کہ نواب صاحب کی سرپرستی میں عصمت اللہ بیگ کے ظرافت اور شگفتہ مضامین کا یہ دلچسپ انتخاب ”مدح ظرافت“ کے نام سے عوام کے سامنے پیش ہے۔

میں محترم نواب طاہر علی خاں صاحب صدر نشین آندھرا پردیش اقلیتی کانگریس کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ موصوف نے عصمت اللہ بیگ کی اس کتاب پر عالمانہ پیش لفظ تحریر فرمایا۔

ہمارے ملک کے نامور اور ممتاز صحیفہ نگار و سکرٹری ادبی ٹرسٹ پدم شری جناب عابد علی خاں مدیر روزنامہ سیاست اور جناب عبدالحمود صاحب سکرٹری ایچ ای ایچ دی نظامس چیمبرسٹل اے دو ٹرسٹ اور معزز ٹرسٹیز صاحبان کا شکریہ ادا کرنا میرا فرضِ اولین ہے کہ ان معزز صاحبان نے اس کتاب کی اشاعت میں جو حقیقی ’عملی سرپرستی اور تعاون فرمایا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ شری خواجہ محی الدین صدر نشین کانگریس فارتھسٹل سالیڈریٹی حیدرآباد، بساط صحافت کی عظیم شخصیت شری علی احمد حنفی اور عارف الدین سلیم ایڈیٹر نیوز ٹرسٹ آف انڈیا، شری قادر علی،

ریونیو ڈیوڈ ٹیلر آفیسر کتہ گوڈم، مشہور ناول نویس شری بصیر افضل اور
کانگریس آئی کے قائد شری ایس اے شکور نے بھی بڑی سرگرمی کے
ساتھ تعاون فرمایا، وہ بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

ہمارا اظہار تشکر بالکل نامکمل رہے گا، اگر ہم جناب ایم بالیا (ایم ایل سی)
سابق صدر نشین "حدا" اور خصوصی طور پر منسٹر شا کرہ بیگ صاحبہ اور منسٹر مرزا
سبحان اللہ بیگ صاحبہ کا شکریہ ادا نہ کریں۔ منسٹر سبحان نے اس کتاب کی اشاعت کیلئے
کمپنی کے ذریعہ تعاون سے نوازا اور کتاب کی تکمیل میں کمپنی کی اعانت کی۔

ازدو کے مشہور شاعر و صحافی جناب وقار خلیل صاحب
نے اس کتاب "متاع ظرافت" کی حسن ترتیب و تہذیب و تدوین
اور زیور طباعت سے آراستہ کرنے کے لیے اپنا قیمتی وقت دیا وہ
بہت قابل تشکر ہے۔

امید ہے کہ عوام "متاع ظرافت" کا شوق و ذوق سے
مطالعہ فرمائیں گے اور دلچسپی سے پڑھیں گے اور اس طرح عصمت اللہ
بیگ کی دیگر تصانیف بھی یکے بعد دیگرے منظر عام پر آتی جائیں گی۔

مصطفیٰ شروانی

صدر نشین

عصمت میموریل پبلی کیشن کمیٹی

حیدر آباد

فروری ۱۹۸۵ء

حمایت نگر

حیدر آباد

تاثرات

خواجہ محی الدین صدر نشین کانگریس فار نیشنل سالیڈ ریشی حیدر آباد
ادب میں مزاحیہ صنف بچائے خود ایک نازک ترین فن ہے
جس سے ہمدہ برا ہونے کے لیے ایک فطر اور بالکمال آرٹسٹ کی
ضرورت ہے۔

میرزا عصمت اللہ بیگ کی فطرت میں چونکہ زندہ دلی،
بندہ بنی، طنز اور ظرافت کے جذبات کی فراوانی تھی اس لیے انھوں
نے نہ صرف یہ میدان اختیار کیا بلکہ برسوں کی ذہنی مشقت کے
بعد ایسی ناموری حاصل کی اور ادب کا ایسا گراں مایہ سرمایہ اپنے
پیچھے چھوڑ گئے ہیں جو مدتوں اردو ادب کی زینت بنا رہے گا۔

عصمت صاحب نے اپنے مضامین اور مقالوں میں سماجی
مفسدات SOCIAL EVILS پر بڑے نفیس انداز میں چوٹیں
کی ہیں۔ ہمارے سماج کے بعض مسائل اور اہم امور پر مزاحیہ
اور طنزیہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں کئی مثالیں
پیش کی جاسکتی ہیں۔

مجموعہ مضامین ”متاع ظرافت“ کا اہل علم اور صاحب ذوق حضرات پوری دلچسپی
سے اور شوق سے مطالعہ کریں گے۔

تہمید

اردو مجلس حیدر آباد کے اجلاس میں پڑھنے کیلئے جناب
سید سجاد مرزا صاحب نے مجھ سے طرانت کے موضوع پر مضمون لکھنے کیلئے
فرمایا۔ میں نے ہنسنے سے "ہوں" کہہ کر گردن تو ہلادی مگر میں چکر میں تھا کہ
یا الہی طرانت پر لکھوں تو کیا لکھوں!

اگر طرانت خوش طبعی کو کہتے ہیں تو پھر خوش مذاقی، مزاح، تسنیر
منصوکہ، زٹل، ہزل اور پھکڑ پن کیا ہے؟

بہر حال میں اسی فکر میں ڈوبا ہوا گردن جھکائے "جوبلی ہلی" سے چلا
اور خیریت آباد کے ٹکڑے تک جا پہنچا، وہیں ایک کچرے کی کنڈی تھی اس
پر نظر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ کنڈی کچرے سے لبریز ہے اس پر مٹی
کے ڈھیلے دیدے پھاڑے ہوئے کچرے کی گاڑی کا انتظار کر رہے
ہیں۔ اور وہیں کاغذوں کا ایک پلندہ گردوغبار میں لپٹا ہوا پڑا پایا،
میلنے وہ پلندہ اٹھا کر کھولا تو دیکھا کہ کچھ تو اس میں انگریزی اور اردو
"پیچ" کے جستمہ جستمہ اوراق ہیں کچھ کارٹون ہیں اور چند جنالی رنگ کے
ورق ہیں۔ جن پر اودی اور سرخ روشنائی سے خام فرسالا کی ہوئی ہے
میں نے اس مسودے پر اوپر سے لیکر نیچے تک نظر دوڑائی تو پتہ چلا کہ
کوئی صاحب خوش مذاقی پر مضمون لکھنے کا کوشش کر رہے تھے۔
خدا معلوم وہ لکھتے لکھتے مر گئے یا مر کر لکھتے رہے اور پورانہ

کر سکے یا بکھتے بکھتے دماغ اُلٹ گیا۔ جو پورا کا پورا پلندہ ابنِ دُفتر بے مہیۃ
غرقِ مئے ناب کہہ کر کچرے کی کنڈی میں پھینک دیا۔ میری اس وقت کی
حالت نہ پوچھیے ایک ہارٹ سر سے اُترا دل بلیوں اُٹھنے لگا اور کانوں تک
باچھیں کھل گئیں مگر انھوں میں اتنا تھا کہ مکمل مضمون تمہیں نہیں پڑھا
پلے تو جھینگروں نے اُسے خوب مزے لے کر مطالعہ کیا تھا اور جملے کا جملہ
چاٹ گئے تھے دوسرے کسی ظالم نے کئی صفحے بھی اڑا دیئے تھے اور تیسرے
پالکے چھٹوں نے بھی کچھ ایسی ستم ظریفی کی تھی کہ جس سے بعض حُزُن سگرا رہے
تھے۔ بعض ہنس رہے تھے، بعض تہقُّقے مار رہے تھے اور بعضوں نے مہنہ پھاڑ
کر اس طرح دانت باہر نکال دیئے تھے کہ ہم تو ہم دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا
ماہر تہقُّقہ باز بھی تپہ نہیں چلا سکتا تھا کہ وہ ہنس رہے ہیں یا اپنی قسمت پر
رورہے ہیں۔

مختصر یہ کہ "اللہ" دے اور بندہ لے جو کچھ ہتھے چڑھا، بڑی احتیاط
سے اپنے بستے میں لپیٹ کر ہم اپنے گھر لے آئے اور گھر پہنچتے ہی آستین چڑھا
کہ ان کاغذات کو صاف کرتے اور یوں دنگلے میں جٹا گئے۔ ان ترکیبوں سے
بشکل جو مضمون تیار ہوا اُسے بکھنے سے قبل آپ پر یہ بات ظاہر کر دینا اپنا
اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ اس مضمون میں سے جو کچھ مجھ سے پڑھا گیا وہ نقطہ بہ لفظ
جوں کاتوں میں نے نقل کر دیا گمشدہ اوراق، کرم خوردہ مقامات اور غیسے
روتے ہوئے جملے جو میری سوچ بوجھ سے باہر تھے وہاں سے طبع آزمائی کی
ہے۔ بس چند باتوں کو چھوڑ کر پورا کا پورا مضمون بقولِ شخص طبع زاد ہے
اگر آپ اسے پسند فرمائیں تو ثوابِ اصل مضمون نگار کا روح کو بخشیں اور اگر
پسند نہ ہو مجھے بخش دیں تاکہ میں اس مضمون کو پھر اسی کچرے کا کنڈی میں پھینک دوں
گا۔ جہاں سے یہ موادِ ناسد میرے ہتھے چڑھا تھا۔ تاکہ یہ بھی کسی اور کھوجی کے ہتھے چڑھ جائے

مرزا عہمت الدبیک

ظرافت کیا ہے

ظرافت کیا ہے؟ ظرافت اور خوش طبعی وغیرہ کا ایک مشترکہ صفت ہے جب یہ اپنا سوانگ بھر کر محفل میں اُترتی ہے تو ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں ہل پڑ جاتے ہیں۔ لیکن ظرافت کیا چیز ہے؟ یہ ایک ٹیڑھا سوال ہے۔ اس کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کیا چیز ہے؟ البتہ یہ بتانا آسان ہے کہ وہ کیا چیز نہیں ہے۔ !

اس موقع پر میں آزاد مرحوم کی زبان میں ظرافت کو ایک شخص قرار دے کر کہتا ہوں اور استعارے کے روپ میں پیش کرتا ہوں جس سے اصلی اور نقلی ظرافت کا اندازہ آپ کو نہایت آسانی سے ہو جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”سچی ظرافت اصلی خوش طبعی کے خاندان کا حقیقی مورث علی ہے۔“

اس گھرانے میں حسنِ ادب ایک نہایت معقول شمع تھا۔ اس کا بیٹا حسنِ کلام پیدا ہوا اس نے اپنے برابر کے خاندان میں شاد کا کی اور اُس کی دامن کا نام ”خندہ جبیں“ تھا جو آٹھ پر ہفتی رہتی تھی اُس کے گھر میں تھاں خوش طبع پیدا ہوئے۔ چونکہ خوش طبع سارے خاندان کا محبوب تھا اور بالکل مختلف طبیعت کے والدین سے پیدا ہوا تھا اس لیے اس کی تین چار رنگی واقع ہوئی تھی۔ کبھی تو وہ نہایت معقول اور سنجیدہ، کبھی ہنس مچا کر لیتا تھا۔ اور کبھی رنگین بان کا بن جاتا تھا۔ کبھی تو الیابین

کر نکلتا تھا کہ گویا ابوالکلام چلے آتے ہیں اور کبھی ایسا مسخرہ بن جاتا کہ ،
 بھانڈوں کو بھی طاق پر بیٹھا دیتا۔ لیکن چونکہ ماں کے دودھ کا بڑا اثر
 ہوتا ہے اس لیے کسی حالت میں بھی ہو، اہل محفل کو منٹے بغیر نہ رہتا
 تھا۔ اب سینے اُسی کے ہمسائے میں ایک جھوٹا مکار خیل ساز بھی رہتا
 تھا اس نے بھی اپنا نام خوش طبع رکھ لیا اور لوگ بھی اُس کو اُسی کا
 قائم مقام سمجھنے لگے تھے اگر کوئی صاحب ایسے شخص سے ملیں تو اہل اس
 کی نسل کو اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھ لیں اور پتہ چلا لیں کہ اس کا رشتہ
 صداقت کے قبیلے سے جاملتا ہے یا نہیں اور حقیقت میں وہ حسن ادب
 کے گھرانے سے پیدا ہوا ہے یا نہیں اگر یہ نہ ہو تو پھر اُسے وہی مکار
 بہر دیا سمجھیں ایک پہچان اس کا یہ بھی ہے کہ جب وہ کسی محفل میں بیٹھا
 ہے تو صرف اُسی کے تہقیرے کان میں آتے ہیں اور اس کے اطراف میں
 معقول لوگ خاموش بیٹھے نظر آتے ہیں اور جب طرافت اصلی محفل،
 آراستہ ہوتی ہے تو وہ خود تو کمالی سنجیدگی سے بیٹھ ہی ہوتی ہے اور اطراف
 اُس کے سب ہنستے ہیں۔

بلکہ ایک بات اور بھی ہے کہ اگر اُس کے خاندان میں خوش طبعی
 یا خندہ خینی یا خوش بیانی یا کسی کی بو نہ آئے تو اُسے بھی وہی جعل ساز
 بہر دیا سمجھنا چاہیئے۔ اب آپ اس بہر دیا کے بھی خاندانی حالات
 سن لیجئے وہ اصل میں جھوٹ کی اولاد ہے اور جھوٹ زٹل قافیے کا باپ
 تھا۔ زٹل قافیے سے ایک بیٹا پیدا ہوا اس کا نام سڑی مستان تھا اُسی
 طرح حماقت ایک جھوٹے عورت تھی اور اس کی ایک بیٹی تھی جسے
 مسخون دوانی کہتے تھے اُس سے سڑی مستان نے شادی کی اب اُن
 دونوں سے وہی طرفہ معجون بہہ پیدا ہوا۔ جسے تم چمکڑا کہتے ہو یعنی
 اوقات اس کے کلام میں بھی خوش بیانی اور خوش طبعی کی بو آتی ہے مگر حقیقت

وہ طرانت اصلی نہیں ہے اس استعارے کو اور بھی پھیلا یا جاسکتا ہے اور ہر دہیے بھانڈ کی اولاد کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو گنتی میں ریگستان کی ریت سے بھی زیادہ ہے مگر اس موقع پر صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ طرانت اصلی اور طرانت نقلی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا آدیا اور بندر میں ہے اس وقت دنیا میں ہر علم و فن کے ادارے کھلے ہوئے ہیں مگر طرانت اور خوش طبعی کی تعلیم دینے کا کوئی ادارہ نہیں ہے جن کی طبیعتوں کو ناپ گانے سے لگاؤ ہو۔ وہ ناپ گانے کی تعلیم گاہوں میں شریک ہو جاتے ہیں جن کو آرٹ سے دلچسپی ہے وہ آرٹ اسکول میں داخل ہو جاتے ہیں مگر جن لوگوں کی طبیعتیں طرانت کا طرف مائل ہیں وہ بچارے ادھر ادھر ٹامک ٹویٹے ہمارے پھرتے ہیں۔ اگر کوئی طرانت کا ادارہ ہوتا تو پھر آپ دیکھتے کہ ایک گھٹلی سے گھٹلی طبیعت کا لڑکا بھی دو دوپے رات تک پُر مذاق لطیف، مزاحیم، جملے اور برجستہ فقرے رٹتا ہوا، دکھائی دیتا اور ہر روتی صورت بچے کے ماں باپ ہی کو شش کرتے کہ ان کا بچہ طرانت کے ڈل اسکول کی ضرور پہنچ جائے۔

طرانت کی تعلیم دینے سے میرا یہ مقصد نہیں کہ زبردستی ہر ایک کا مذاق اڑایا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ ہر شے کو ظریفانہ رنگ میں دیکھ سکے اور اس کے ہر پہلو کو ایک دلچسپ اور لطیف انداز میں ظاہر کر سکے جس میں زکاوت اور دانائی کے ساتھ ساتھ بے شائبہ اور خوش دلی کے اجزاء بھی موجود ہوں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ اجزاء پیدا کس طرح سے کیے جائیں۔ بس یہی ہم کر سب نے ہتھیار ڈال دے رکھے ہیں اور ہر ایک ماہر طرانت اپنی اپنی ڈنلی اور اپنا اپنا رنگ الاینے لگا۔ ایک مشہور و معروف ظریف کا نظریہ ہے کہ جس قدر تناقص اور متضاد کیفیات پیدا کی جائیں

گی اتنا ہی ظرافت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ مثلاً کوئل صاحب چوڑے
 چکلے برقعہ چٹقٹے صحت بنائے بھاری بھر کم تو نیلے نہایت ہی
 پر تکلف کپڑے زیب تن کیے بھونک بھونک کر قدم دھرتے چلے
 جا رہے ہوں۔ یکایک ان کا پاؤں پھسلے اور وہ قلاع بازی کھا کر اڑاڑا
 دھم سے نیچے آ رہیں کپڑے کیچڑ میں لپٹ پٹ ہو جائیں ٹوپی ایک طرف
 جا پڑے خود چیت پڑے ہوئے ہوئے کچھوٹے کی طرح ہاتھ پاؤں ماریں
 تو نہ ٹیکڑے کی طرح الگ ہلی رہی ہو۔ اٹھنے کی کوشش کریں پھر پھیلیں
 اور چاروں شانے چیت پھر زمین پر آ رہیں۔ پھتے ہوئے مجمع کو دیکھ کر
 خستے سے ہونٹ چبانے لگیں اور سر بازار گالیوں کی بوھڑ
 باندھ دیں تو ان کی ہیبت کڑائی پر خواہ مخواہ لوگوں کو ہنسی آ جائے گی۔

پُر تکلف کپڑوں کا کیچڑ میں لپٹ پٹ ہونا، قدم بھونک بھونک
 کر دھرنے کے باوجود ٹانگ کا پھلنا اور بائیں ریش و نش سر بازار
 لوگوں کو بے نقط سنانا یہ سب کی سب مفاد کیفیتیں ہیں اب ان میں جس
 قدر تناقص پڑھتا جائے گا اسی قدر پختہ ہونے کا مال مسالا پیدا ہوتا
 چلا جائے گا۔ اگر ان بزرگوں کے بچائے کوئی ایراغرا نہ ہو خیرا ہوتا تو اس
 بیمار سے پر کوئی پلٹ کر بھی نہ تھوکتا اور آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا
 بعض لوگ کہتے ہیں کہ نش، گالی گلوچ، رکیک اور صوفیانہ باتوں اور
 زلی تافنیوں سے ظرافت پیدا کی جاتی ہے بعض کہتے ہیں کہ بے تعلقی
 اور بے سرو پا باتوں کو اگر کسی خاص طریقے سے اچھی طرح چکایا
 جائے تو ان سے بھی تعجب اور خوشی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے مگر
 سچے پوچھ تو یہ سب کی سب باتیں اسی چھوٹے اور ہر دے بھانڈ کی نل
 سے ہیں۔ جیسے ہزل، زلی اور پھکڑ کہتے ہیں۔ اصلی ظرافت یعنی مزاح اور
 خوش مذاقی کی ایک خاص زبان ہے۔ اور سچائی، فصاحت، حسن بیان

حسنِ کلام اور حسنِ ادب اس کا ایک لازمی جزو ہے
 میں نے ابھی آپ سے عرض کیا تھا شعرو شاعری اور دوسرے
 علوم و فنون کی طرح ظرافت کی بھی ایک خاص زبان ہے ظرافت نگاری
 اور مزاحیہ مضمونوں میں قابلیت بگھانا، عربی اور فارسی کی ٹانگ توڑنا
 اور جا بجا علمی اڑڈنڈے لگانا۔ ظرافت کا گھلا گھوٹنا اور اپنا مذاق
 اُڑاتا ہے یہی ایک معمولی سی چیز ہے مگر اس عنوان پر بھی کئی خوش مذاق
 لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ دوچار نمونے سناتا ہوں اس سے
 سن کر آپ خود تعریف فرمائیے کہ ان میں سے کس کس نے ہنسی کو لطیف
 رنگ میں دیکھا، کیا خوشگوار انداز اور ظرافت کا زبان میں پیش کیا ہے
 سب سے پہلے تو خود میری زبردستی کا ہنسی ملاحظہ فرمائیے
 ہنسی ایک متعدی کیفیت ہے جہاں دوچار آدمی مل کر بیٹھا دھڑان میں
 سے کسی طریق نے کوئی چٹ پٹا قصہ بھڑا اور اُدھر اس کے باثرات
 ظاہر ہوتے شروع ہو گئے اسی طرح ظرافت کے جراثیم کانوں
 کی راہ سے مختلف غددوں کو گدگاتے اور خاص خاص رنگ پھیون کو
 پھیڑتے ہوئے جسم میں سرایت کرتے جاتے ہیں، جلے کا ابتداء دماغ
 سے ہوتی ہے پھر اس کا اثر ہونٹوں، آنکھوں اور چہرے پر ظاہر
 ہوتا ہے مگر اختتام اس طرح ہوتا ہے کہ انسان بے تاب ہو جاتا
 ہے۔ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ ہنہ کھلی جاتا ہے ہنسی باہر نکلی آتی
 ہے اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبا کر حلق سے وہ وہے سرکا
 آواز میں نکالتی شروع کر دیتا ہے کہ خدا کی پناہ !

جناب سجاد مرزا صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے ہنسی اور مسکراہٹ دو
 الگ الگ چیزیں ہیں۔ ہنسی کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ گو بخند الی ہنسی، خشک ہنسی
 کھوکھلی ہنسی ہنسی کا خاصہ انسان میں یہ نایہ نہیں ہے ہنسی میں بہت

سے جھپٹائی خواہ رہیں، دل کھول کر ہنسنے کے بعد انسان کو سانس لینے میں بہت آرام محسوس ہوتا ہے کیونکہ جس طرح دوڑنے کے بعد پھیپڑوں کی پروا اٹھان ہو جاتی ہے اسی طرح ہنسنے کے بعد اُس کی وہی حالت ہے۔۔۔۔۔ جب انسان ہر خوشی کے موقع پر ہنسنے کا عادی ہو جاتا ہے تو اُسے ہر مرتبہ ہنسنے میں خوشی حاصل ہونے لگتی ہے البتہ بلا وجہ ہنسنے حماقت ہے۔

لیکن آخر ہم ہنستے کیوں رہیں؟ جو باتیں ایک شخص کو ہنساتی ہیں یا اودھا دوسرے کو نہیں ہنساتیں۔ اس کا جواب شکل ہے!۔

مولوی عظمت اللہ خاں کی ہنسی ملاحظہ فرمائیے۔ "ہنسی بھی بسورنے کی طرح ایک متعدی کیفیت ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہنسی کیا ہے یعنی اگر کوئی ہنستا ہے تو کیوں ہنستا ہے؟ نئی روشنی کے نوجوان شام کے وقت سائیکل کا پیہم پھلا اور پیچا رے ہنسی کے کھلاڑی گرے اور اٹھ کر سفید فلائین کا چیلون جھارنے لگے چند بازاری لڑکے۔ کچڑ میں کھیل رہے تھے انہوں نے بے ساختہ فرمائی تھی ہم لگایا اور لوگ بھی ہنس پڑے۔ جو بہت زیادہ نازک تھے۔ وہ صرف مسکرانے لگے۔ تو اس میں شک نہیں کہ ہنسنے کیلئے یہ بلنسنے کی ضرورت نہیں کہ ہنسی کیوں آتی ہے؟ ہم ہنستے ہیں اس لیے کہ ہنسی آتی ہے ہم کھانا کھاتے ہیں اس لیے کہ کھانے کو جی چاہتا ہے۔

اگر آپ ہنسی تو سوچ کر ہنسی منہ پھاڑ کر ہنسا بھی موقع پر مناسب ہوتا ہے لیکن یہ ہنسی خالی خولی گرج ہے۔

دوسرا باد چھاری، کی ہنسی دیکھئے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ خوب ہنسو کیونکہ ہنسنے سے پھیپڑوں کا اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے یہ بات درست بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہمایوں کے ایڈیٹر صاحب نے بھی۔ اسی لکھا ہے البتہ یہ ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ ہم لگانا پھیپڑوں کیلئے زیادہ مفید

بعض مورچال کرتے ہیں بعض دونوں قدم فرش پر جمائے اس طرح پھسلے ہوئے کوئی اسکیٹنگ کر رہا ہو مگر جہاں نظر چوکی اور دھم سے چاروں شانے چت گرے اور سرکس مسخروں یا بھانڈوں کی طرح قلابازیاں کھانے لگتے ہیں۔

مزاح ہو یا ظرافت، خوش طبعی ہو یا خوش مذاقی اس کیلئے کڑی اور اولین شرط یہ ہے کہ اندازِ بیاں، حسنِ کلام، فصاحت میں ڈوبا ہوا ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ رکاکت، سوتیانہ پن، فحش، پھکڑ اور رکیک، الفاظ ہرگز نہ ہوں اور تیسری بُری بات یہ ہے کہ کسی کی ٹوپی نہ اُچھالے۔ خود کا مذاق نہ اُڑائے اور اپنے عزیز و اقارب کو زبردستی کھنچ کر سربازارِ رسوا نہ کرے۔ اندازِ بیاں اور حسنِ کلام فصاحت کے علاوہ دو چار صفتیں اور بھی ہیں جن سے تحریر اور تقریر میں شگفتگی اور ظرافت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اُن میں سے ضلع، جگت، پھٹی، تجنیس اور ابہام کی تو یہ کیفیت ہے کہ وہ ہمیشہ ظرافت اور خوش مذاقی سے لپٹی ہوئی رہتی ہے پہلے ضلع کا حال سن لیں اس صفت کو گھٹا درجہ کے شعراء اپنے شعروں میں اور بڑھیا درجہ کے خوش مذاق لوگ ظرافت پیدا کرنے کیلئے عام طور پر اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔

اس صفت کا دوسرا نام ”درعایتِ لفظی“ بھی ہے اس لیے اس میں ایسے لفظ استعمال کیے جاتے ہیں جن کو دوسرے لفظوں کے ساتھ محض ایک لفظی تعلق ہوتا ہے۔ مگر ان کے معنوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

جگت ہندی کا لفظ ہے اس کے معنی حکمت و دانائی کے ہیں لیکن اردو میں عام طور پر لطیف گوئی کو جگت بازی کہتے ہیں۔

۲۷
غالب سے قبل کئی شعراء نے ضلع بولنے والوں پر جو میں کی ہیں۔ چنگیزی
سودا کہتے ہیں

’پکڑی جو لٹورے نے کہیں کھیتی ~~چھوڑ دیا~~
سمجھا کہ نہیں باز کوئی ’ مجھ سا ~~کلاں~~
استاد کی اُن کے ہے انہوں کو یہ نصیحت
لفظی نہ تناسب ہو تو کچھ مت کر و خسیر
اتنا تو تلازم رکھو الفاظ کا ملحوظ
بے پنجہ و ناخن نہ نکھو دودھ کو تم شیر
جب تک کہ نہ منعلوم ہو پاسنگ و ترازد
بازدھو نہ کبھی شمسدر میں تم لفظ شکمیر
یہاں پنجم، ناخن، شیر، پاسنگ، ترازد اور شکمیر۔ یہ سب
ضلع کے لفظ ہیں جنہیں اعراض کے پردے میں نکھ کر خود اپنا بھی
زور قلم بتا دیا ہے۔

ضلع کی دو قسمیں ہیں ایک تو یہ کہ جس چیز کا نام لیا جائے وہ ایک
سالم لفظ سے ظاہر ہو جائے جیسے کہ یہ ایک مشہور لطیفہ ہے۔
”جج بھی کانا تھا اور ملزم بھی کانا تھا۔ ملزم نے ہاتھ جوڑ کر
عرض کی کہ سرکار ہم چشموں پر چشم عنایت چاہیے جج نے آنکھ مار کر
کہا کہ یہ عدالت ہے ہم سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں ملزم نے کہا کہ
یہ تو حضور کا عین انصاف ہے مگر آپ کے لوگوں کو مجھ سے چشم
ہے اس لیے ڈرتا ہوں کہ میرے حق میں کہیں انصاف کی دوسری آنکھ
بھی نہ بند ہو جائے۔“

یہاں کانا نام چشم، چشم عنایت ایک آنکھ سے دیکھنا عین

چشمک یہ سب ضلع کے لفظ ہیں۔

اس کی دوسری قسم وہ ہے جس میں الفاظ زبردستی کھنچ تان کر
بٹھائے جاتے ہیں مثلاً۔ کسی کنجوس نے ایک طرف سے نو چھاکہ میں
اپنے بچہ کو کون سا علم پڑھا ڈوں طرف نے جواب دیا کہ ”صرف نہو“
(یعنی صرف نحو)

جس طرح اکثر لوگ بیت بازی وغیرہ میں اپنا وقت گزارتے ہیں
اسی طرح محض رنگیں مزاج اور خوش طبع لوگ ضلع بازی میں اپنا
وقت صرف کرتے ہیں جہاں دو آدمی مل کر بیٹھے اور ضلع شروع ہوگی
مثلاً کسی صاحب نے بیٹے بیٹے حقہ سرکایا اور یاروں نے حقہ پر ضلع
شروع کر دیا۔ چند ضلع کے لفظ آپ بھی سن لیجئے۔

واہ رے لڑکے تیری جوانی

سر پر آگ بدن میں پانی !

ابھی سے تیری ایسی خوبو

ہنہ سے آوے دودھ کی بو

ضلع کے الفاظ

دندے میں دم نہیں اب خیر مانگو جان کی

دم کے پیو یہ دندے جب دم نہیں تو کچھ نہیں

ایں گل دیگر شگفت، بندہ ہر دم تازہ رہتا ہے، دل کی کلی کھلی

رہتی ہے۔ اگر کوئی میرے ہنہ کو آئے تو ہنہ نالی میں دے دو۔ ایسی

دھواں دھار تقریر کہ سب کے دھوئیں اڑ گئے۔ اگر کوئی میرے

ہنہ کو آئے تو ہنہ میں نالی دے دو۔

وہ ہنہ لٹکاتے ہوئے چپکے سے شک گیا سر پر تو بازہ کراڈ

اللہ سے لوگاد و غیرہ بظاہر ان الفاظ میں نہ تو کوئی طرانت معلوم ہوتی ہے اور نہ اس قدر دم ہے کہ سینے پہناتے کا ذریعہ بن سکیں مگر یہ بات ضرور ہے کہ اگر ہر محل کسی گفتگو کے سلسلے میں ضلع کے الفاظ بٹھا دئے جائیں۔ تو پھر اٹھائے نہیں اٹھتے اب آپ اس کی چند مثالیں سنئے۔

ضلع میں گفتگو: ایک صاحب کسی جوتے والے کی دکان پر پہنچے
دکاندار۔ کیا حکم ہے؟
خریدار۔ ایک خوبصورت اور اچھے جوڑے کی ضرورت ہے۔
دکاندار۔ حضور تو نری کا چاہتے ہوں گے۔
خریدار۔ مجھے وصلی کا درکار ہے ذرا خوش رنگ اور مضبوط
تلی کا ہو۔

دکاندار۔ حضور کوئی فکر نہ کریں انشاء اللہ ایسے جوتے دوں گا
حضور عمر بھر یاد کریں گے۔ ذرا سراٹھا کر دیکھئے وہ جوتے جو بالکل
حضور کے سر پر دکھائی دے رہے ہیں نہایت خوش رنگ اور مضبوط
ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ آپ کو بہت مسختے پڑیں گے یعنی نو جوتا چار روپے
خریدار۔ اب آپ لوگ بے حساب کھانے لگے ہیں۔ پہلے
تو آپ چار روپے جوتا کھاتے تھے اور اب آپ دو دو اور چار چار
روپے جوتا کھاتے ہیں۔

دکاندار۔ آپ جو فرمائیں آپ خریدار ہم دوکاندار مگر
حضور ہم اپنے جوتے زبردستی تو کسی کے سرمارتے نہیں اگر آپ کو
اچھا لگے یہ جوتا حاضر ہے ورنہ جہاں آپ کو کم داموں پر پڑیں،
وہاں جا کر لے سکتے ہیں۔

ضلع میں طرافت، ایک جام کالڑ کا بڑے ہودے پر پہنچ گیا۔ ایک روز خفا ہو کر اس نے اپنے دفتر کے منتظم پر جرم نامہ ٹھوک دیا منتظم صاحب جوش میں غبرے ہوئے ان کے مکان پہنچے اور کہا کہ سدکار نے تو لے لے اترے سے میرا سر موڑ دیا۔ جام کے لڑکھنے کا ذرا سوچ کر بات کرو۔ منتظم نے کہا اب اور کیا سوچوں صاف صاف کہتا ہوں، پوست کندہ کہتا ہوں اگر بال برابر بھی فرق ہو تو آپ میری داڑھی بوھیں حق کے پالے سے موڑ دیتے۔

ایک سفید پوش اپنی شیردانی ہاتھ میں لے واشنگ کمپنی پہنچے۔ منجھرنے پوچھا کیا حکم ہے؟ فرمایا مجھے استری کی ضرورت ہے۔ منجھرنے جواب دیا اس وقت ہمارے یہاں کندی ہو رہی ہے۔

شاعرے: مکھنؤ کے ایک شاعرے میں شاہ نصیر نے ایک غزل نہایت مشکلی طرح میں پڑھی اس کا مطلع تھا۔
خال پشت لب شریں ہے غسل کی مکھی

روح فریاد لیٹ بن کے جبل کی مکھی
کسی صاحب نے ایک شعر پر کہا کہ سبحان اللہ کیا مکھی بیٹھی ہے۔ کسی نے کہا کہ حضور! یہ مکھی تو ٹھیک نہیں بیٹھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ قبلہ غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلانے لگا۔ شاہ صاحب نے فرمایا جہنم چاشنی سنھی کا مذاق ہے وہ تو لطف ہی اٹھاتے ہیں ہاں جہنم صفرائے حسد کا زور ہے اُن کا جی بھی متلائے گا اور ردی بھی آئیں گی۔

ایک صاحب نے اپنے بچے کا ختم کیا اور اجاب کو دعوت دی، مکان چھوڑا تھا اس لئے دعوت کا انتظام ایک خواجہ سرا کے مکان میں کیا استاد ذوق بھی مدعو تھے کھانا کھا کر صحن میں آ بیٹھے اتنے میں میر بان پان

لیئے ہوئے آئے حکیم آغا جاں عیش نے کہا آج تو دستِ مبارک سے گلوری
 کھانا واجب ہے ذوق نے کیا خیانت تو سنت ہی تھی۔ حکیم صاحب نے کہا
 ان کی طرافت کے نکتے کو کہاں تک پائیے قصے کی خیانت کی اور خواجہ سرا کے
 مکان میں کھانا کھلایا۔ ذوق نے کہا طرافت پر طرافت یہ کہ کھلایا بھی تو ضعیف^۱
 یہ صفت بازار میں ایسی چل نکلی اور ایسی چلی کہ ہر عالم دجاہلی اس کے
 سودے میں گرفتار ہو گیا۔ اور ظریفوں نے وہ وہ دریا پھاٹے کہ سب کارناموں
 پر پانی پھر گیا۔ ضلع کے الفاظ میں طرافت کی زیادہ کیفیت تو نہیں ہوتی
 لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر بر محل اور ہر موقع نظم و نشر میں ضلع کے
 لفظ بیٹھا دیئے جائیں تو پھر لطف آتا جاتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کے
 چند شعر سن لیئے۔

داڑھی موچھوں کا سب صفا ہے

فارغ البال اس کو کہتے ہیں !

کی ہے مدد سے نہ کھٹی پیٹ میں

بالی لا ہر رگ کے اندر ٹھیک ہے

حضرت نزلہ ہیں صدر انجمن

دم بدم اُن کی بھی اک تحریک ہے

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہہ دیا

آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

اب ذرا طلب اور موسیقی کا ضلع ملاحظہ کیجئے مذہب اور جہاز کی کھتے

ہیں کہ اتحاد پارٹی میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے ہر موسم میں مناسب بدرتہ کے

ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے اور ہر مذہب و ملت کے لوگ اس سے

استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ اسے ہاتھ سے نہیں بنایا جاتا بلکہ اس کے سارے

اجزاء و سرکاری مشین کے زور سے مجتمع کیے جاتے ہیں۔
 حقوق کے کڑکڑاتے جاڑے میں اسے شربت انتشار سیلیبت
 یا غرق اختلاں سم آئینہ کے ساتھ استعمال کیجئے۔ باضم مرض متعدی تھلا
 مالکزاری ہے۔ حب وطن کے مواد ناسد کو خارج کرتی ہے۔ اور اتحاد
 قومی کے سدّوں کو کھولتی ہے اصول پرستی کی رطوبتوں کو خشک کرنے
 اور ابن الوقتی کے مصالح خون کی تولید میں بے نظیر ہے۔

حکیم صاحب آخر حکیم تھے ملاقات ہوا تو اول تیافہ سے ہر
 گفتگو سے نبض دیکھی معلوم ہوا کہ شدید سے زیادہ مادہ نہیں۔ مگر یہ طرفہ
 معجون انسان تھوڑی سی ترکیب میں رونق محلی ہو سکتا ہے حکیم صاحب
 نے سوچا کہ ان کے گداز سے کیلئے کوئی نسخہ ضروری تجویز کرنا چاہیے
 ہڈ ہڈ کو اڑا کر دربار میں پہنچا دیا۔

غرض کہ اس قسم کی بنیادوں تحریریں میں جس میں "طب کے ضلع"
 نے ایک لطف اور مزاج رنگ پیدا کر دیا اس کے علاوہ موسیقی کے ضلع سے
 متعلق چند نمونے اور ملاحظہ فرمائیے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ گفتگو میں
 موسیقی کا ضلع کیا رنگ پیدا کر سکتا ہے؟

موسیقی کا ضلع، مسلم لیگ نے جنگلے کے بعد دیوں کا دھن پھڑی ہے
 اور سر دزیر حسن کے متعلق یہ کہنا سبباً نہ ہوگا کہ جنگلے کا راہ سے چلا دیں
 لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تو سنگیت سبھا کا آغاز ہوا ہے بڑے بڑے
 کلا دنت اور نایک جن کے سامنے تان سین کے دیک کا چراغ نہیں ملتا
 بلکہ باز بہادر کا سکھ ملہار پانی بھرتا ہے سبھا میں آنے والے ہیں ان
 کے کھال بھا ہزار انکار کئے لیکن سُم بہ پہونچ کر سب کے سر ہل جائیں گے۔
 کچھ دنوں میں دیکھئے گا کہ سرتارنگ، سارنگ، سنار میں کے اور سرتری

شکھ گوڑ گوڑ سا رنگ میں مچلن اصرار کے - تنگے تنگے گانے کا ازادہ کر رہے
ہیں۔ آبداروں نے بھی تہم کر لیا ہے کہ جل تنگ بجائیں اور ملہا رگائیں۔
سنائے کہ راجہ غنفر علی اصرار سے آملے۔ یعنی اکتادہ دو تارہ بن
گیا دیکھے۔ اتحاد ملت کب دسی دو تارہ پر تغیر اتار پڑھا کراسے
ستار بناتی ہے۔

پھبتی کہ خصوصیت، دوسری چیز پھبتی ہے۔ پھبتی کے معنی نام سے
نکلا ہر ہیں۔ اس کو اسم یا صفت ہونا چاہیے یعنی جس پر پھبتی کسی جاے
وہ ایسی ہو کہ اس پر سولہ آنہ پھبتی ہو۔ یہ ایک قسم کی تشبیہ ہے
جس سے کوئی ذم یا طرافت کا پہلو نکلتا ہے چنانچہ تشبیہ سے تو یہ
مقصود ہوتا ہے کہ کسی کے حسن کو دور بالا کر دیا جائے۔ اور پھبتی سے
یہ مقصد ہوتا ہے کہ کسی اچھی چیز کو ایسی انوکھی چیز سے طرافتاً تشبیہ
دی جائے کہ وہ مفہوم خیر بن جائے۔ چنانچہ غلام صاحب فرماتے ہیں کہ
اور کی پھبتی کسوں بن آئے ہو لنگور سے

داڑھی منڈ دھواڈ میں باز آلا خدا کے نور سے

جس طرح کیری کبیر (CARI CHIRE) یا کارٹون

میں کسی کے حسن و قبح کو مبالغہ کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں اور
تصویر کے خطوط گھٹا بڑھا کر ایک پُر مذاق مگر بامعنی حلیم
بنادیتے ہیں۔ اسی طرح پھبتی کہنے والا بھی کسی کے قد و قامت،
چال، ڈھال، شکل و شبابت، وضع قطع یا رنگ و روپ کو اشارتاً
یا کنایتہ کسی ایسی چیز سے تشبیہ دے جاتا ہے جو مفہوم خیر ہونے
کے علاوہ اس سے اس طرح جاچکتی ہے جیسے گوند سے کاغذ۔

تشبیہ اور پھبتی کا فرق، تشبیہ اور پھبتی کا فرق اس مثال سے

واضح ہو جاتا ہے کہ اگر کسی کا لے یا سیاہ روشنی کے چہرے پر تشیم کا
 رنگ دہن چھڑھا کر اسے ایک بترک شکیلی میں پیش کریں تو کہیں گے کہ
 اس کا چہرہ ننگ اسود کی طرح چمک رہا ہے یا اس کا آنا ابر رحمت کا آنا
 ہے اور اگر بھتی کا سیاہ پالش مل کر اس کے رنگ کو چمکائی ہو گے۔
 تو کہیں گے کہ وہ آبنوس کا کدہ ہے وہ مرگھٹ کا گوشت ہے وہ تبا کو کا پند ہے
 وہ چراغ رکھنے کا دبوٹ ہے وہ چلا ہوا تیرا ہے وہ کالا پر مٹا ہے
 وہ اٹا تو ہے وغیرہ وغیرہ غرض کہ بھتی کے میدان میں جیت تک بونے
 کو پٹنی مرغایا چنیا بلخ اور موٹے تازے آدمی کو دم کٹا بھینسا
 ساندھ گنید اکہم کر نہ چھوڑیں تو تماشا یوں کو کبھی لطف نہیں آتا
 نمونے کے طور پر مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کی بھتیاں ملائے فرمائیے
 لیجئے ! اب مولوی صاحب کا حلیم سینے رنگ سائوالا مگر دکھا قد
 اونچا تھا مگر چوڑا ان نے لبان کو دبا دیتا تھا۔ فرماتے تھے۔ بچپن میں
 ہڈ زش کا شوق تھا۔ ورزش چھوڑنے سے بدن جس طرح مروں کا
 تھیلہ ہوتا ہے بس یہی کیفیت تھی سر بہت بڑا تھا مگر بڑی مدد کی صفائی
 کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا جو تھوڑے رہے تھے
 بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کر دیئے جاتے تھے۔ ورنہ بالوں
 کی یہ نگرانیہ تعیش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھال کا نمونہ ہو جاتا
 تھی۔ جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ شرم بج رہا ہے ناک
 کسی قدر چھوٹی اور نتھنے بھاری تھے اسی ناک کو گواروں کی اصلاح
 میں گاہر اور دہلی کے بول چال میں پھلکی کہا جاتا ہے ڈاڑھی بہت چھدری
 تھی بالوں میں سے ٹھوڈی اس طرح دکھائی دیتی تھی جیسے بلیں ریز
 ڈالنے سے اکسرتے کے اندر کا چینر۔

جارے میں سر پر کٹو پ رہتا تھا مگر بڑا دقیقاً فوسی بھی اس کے دونوں پاؤں پر اوپر کی طرف سیدھے ہو کر لاٹ پادری کا ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرے کا کام دیتیں بھی پاؤں کو ہر پر اوپر تلے ڈوریوں سے کس دیا جاتا اور اس طرح کٹو پ نیلٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا۔

پھبتی کا ایک اور نمونہ، ذرا ان پڑے میاں کی بڑھیں کو تو دیکھئے نہہر بچی آنکھیں رندھا کٹوا گالوں پر جتے ہوئے کھیت کی طرح چھریاں کمر خم جیسے تیغ رختہ دم شادی کا سنا تو کرسی پر اس طرح با بیٹھا جیسے ماری کی دگڈی پر لنگور ہر کیف شادی ہوئے۔ نقاب زریں جو اٹھایا تو عجیب منظر نظر آیا ادھر دو این کا وہ نور عالم را فردز اور ادھر یہاں کا لے بھیجنگا شکل کے روز چمے چاند کو گھس لگ گیا۔ شاخ صد لی پر مار سپاہ کا تہنہ ہوا

پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت
زارغ کے چونچ میں انگور خدا کی قدرت

تجینس لفظی :- شیری تجینس ہے ایک لفظی اور دوسری تجینس نام

جب دونوں میں سے کوئی بھی بہر دپ بدلے ہوئے محفل طرافت میں آتا ہے تو ایسی ایسی مضحکہ خیز شکلیں بناتی ہے کہ غتے ہتے پیٹ میں بلی پڑ جاتے ہیں۔ ارد میں کسی خط رائج میں ترسل، شکمہ رقا ع اور شفیا وغرہ، بعض خط شفیا کے ماہر لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پیاز کے لمبے کاٹ کر رکھ دیئے ہیں۔ صاحب عالم مار ہری کا خط بھی اس قبیل کا تھا۔

غالب نے ایک مرتبہ انہیں لکھا

حضرت! لکھی ہوئی عبارت سے جو سمجھتا ہوں اس کا جواب لکھتا

ہوں جو کچھ مجھ سے نہیں پڑھا گیا وہ تعویذ بانڈھ کر رکھتا ہوں۔ اگر

بغرض ممال بھی ملاقات ہوگا تو آپ سے دریافت کر کے پانچ گز بانڈ گا۔
 بعض لوگ خط شکستہ ایسا لکھتے ہیں کہ بس قلم توڑ رہے ہیں مگر نقطے
 مفہم کرتے ہیں نکتہ رس بلعین اس میں وہ وہ لکھتے پیدا کرتے ہیں کہ وہ اچھا
 خاصہ لطیفہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ غالب نے انوار الدلہ شفیق کو لکھا
 ایک لطیفہ نشاط انگیز سیٹے۔ ڈاک کا ہر کارہ چوبلی ماراں خطوط،

لیجاتا ہے اس نے داروغہ کو خط دیا اور داروغہ نے وہ خط دے کر مجھ سے
 کہا کہ ڈاک کا ہر کارہ بندگی عرض کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ
 کو جیادلی کے بادشاہ نے نواب کا خطاب دیا تھا آپ کا پالے سے خطاب پکتانی
 کا ملا ہے حیران کہ یہ کیا ہے سرنامہ کو غور سے دیکھ کہیں قتل از رسم مخدم
 نیاز کشیاں نکھاتا تھا۔ اس فرم ساقی نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے
 کیتیاں کو پکتان پڑھا۔

نواب علاء الدین کا تخلص نبی تجرید کیا تھا وہ تھے دہلی۔ بدگمان
 ہوئے کہ کہیں نبی کو کوئی پیشی نہ پڑھے۔ انہوں نے گہرا کریم شبہ
 غالب پہنچا ہر کیا۔ غالب نے جواب دیا۔

میری جان تمہارا تخلص بہت پاکیزہ ہے اور میرے کو پسند ہے۔
 پیشی کو یہ تکلف نبی کا مصروف کیوں کھراؤ۔ یہ میدان تو بہت فراخ ہے۔
 اور ایک اچھا تخلص ہے رہبر داس کی تجنیس موجود ہے شیون ایک اچھا تخلص ہے
 ستون اس کا تصنیف ہے تمہارے واسطے فخری تخلص بہتر ہے مگر تم کہو گے
 کہ آزاد پور کے باغ میں ایک آک کا نام فری ہے

اکثر لوگ ایسے ستم ظریف ہیں کہ کسی سے غلط سلاط لفظ سن کر ٹوکنے
 کے بجائے خوش ہوتے ہیں کہ دلکی کا بنیا سامان پاتھ آیا ایک..... بنگالی بالوت
 کو ناری کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ وہ فرصت کے اوقات میں ایک مولوی صاحب

سے تھوڑا بہت پڑھا کرتے تھے۔ لیکن دم بخود کو ہمیشہ دم بخور کہتے تھے کسی نے مولوی صاحب سے کہا کہ میں تو بالو صاحب سے کہنے کی جرات نہیں ہوتی۔ آپ اس غلطی کا اصلاح کر دیجئے۔ مولوی صاحب نے کہا بھائی! میاں صاحب کی یہی غلطیاں تو میری زندگی کا سہارا بنی ہوئی ہیں اگر ان کی اصلاح ہوگی تو پھر مجھے کون پوچھے گا۔ غرض دم بخود کہتے کہتے بالو صاحب کا دم ہوا ہو گیا۔ اسی قبیل کا ایک لطیف بھی سن لیجئے :

ایک منشی جی کسی ڈپٹی کلکٹر کی پیشی میں کام کرتے تھے ایک عرضی آئی منشی جی نے فوراً ڈپٹی کلکٹر کو سنانی شروع کر دی عرضی کے ختم پر نکھاتھا۔ راقم بالو ولد ننھو قوم گھوڑا پیشہ پٹواری ساکن پیپل باندھا۔ منشی جی نے اپنی روالہ میں بالو کو یا پو پڑھا، ننھو کو ٹٹو، قوم گھوڑا کو قوم گھوڑا، پیشہ پٹواری کو پیشہ سواری اور ساکن پیپل باندھا کو ساکن پیپل سے باندھا ان کی تک بندی ایک بار پھر سن لیجئے۔ راقم بالو ولد ٹٹو قوم گھوڑا، پیشہ سواری ساکن پیپل سے باندھا۔

اہم :- چوتھا اہم ہے جس کے لغوی دو معنی لغوی کے ہیں۔ چنانچہ اکثر شعرا و ادب ظریف باتوں باتوں میں ایک ایسا لفظ بول جاتے ہیں جس کے دو معنی ہوتے ہیں۔ گویا دقت واحد میں وہ ایک لفظ سے دو معنوں کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں۔

جس کے ایک معنی کو دوسرے معنی سے کولا تعلق نہیں ہوتا یہ دو رنگی باتیں اور دقت واحد میں دو مختلف مفہوم سا معنی کے دلوں پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔

یہ وہی صفت ہے جس نے انشا اللہ خاں کو الٹ دیا تھا اور نواب سعادت علی خاں صاحب کے دل میں زخم ڈال دیئے تھے۔

میں کہ نواب سعادت علی خاں لونڈی کے پیٹ سے تھے ایک دن مجلس میں
 شرفا کی شرافت اور نجابت کے تذکرے ہو رہے تھے نواب نے کہا کہ
 ہم بھی نجیب الطرفین ہیں انشا اللہ خاں بھلا کہاں جو کہنے والے تھے۔ کھنکے
 حضور نجیب ہی ہیں۔ بلکہ انجیب ہیں۔ انجیب کے ایک معنی تو انتہا درجہ کا
 شریف الثامان اور دوسرے معنی ہیں لونڈی زادہ ولد الجاریدہ نجیب
 زبان والی کی کٹول: زبان کا حد تک تو میں یہ صفت زبان والی کی کٹول
 ہے۔ اگر اس قسم کے الفاظ واقعہ متعلقہ سے لپٹے ہوئے اور برجستہ
 کہہ دے جائیں تو بولنے والے کی حاضر جوابی ذہانت اور علمی ذوق کا
 بے ساختہ داد نکل جاتی ہے جو لوگ زبان کے مختلف پہلوؤں سے
 ناواقف ہوتے ہیں۔ ان کے منہ سے بے اختیار ایسے جملے نکلا جاتے ہیں جن میں
 ہزاروں طرح کے برے پہلو موجود ہوتے ہیں۔ وہ لوگ اس کمزوری کو
 محسوس نہیں کر سکتے مگر لوگ سنی کر بے اختیار ہنس پڑتے ہیں۔
 مولانا عبدالحلیم شرر نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک بنگالی عالم جو
 اردو زبان کے بھی ماہر خیال کیے جاتے تھے ایک روز مولانا سے آکر کہنے
 لگے کہ جناب یہ بھی کوئی زبان کی خوبی ہے کہ میں نے لکھنوکا ایک صحبت میں
 کیا کہ میں آج کل دودھ پیتا ہوں تو اس پر لوگ بے ساختہ تہقیر مار کر
 ہنس پڑے مولانا نے جواب دیا کہ یہی تو زبان کا حسن ہے چونکہ آپ
 زبان میں ماتھیں ہیں اس لیے آپ کو بچائے اپنے عیب کے زبان کا عیب
 نظر آیا دودھ پینا شیرخوار بچوں کا کام ہے۔ اور عاتل و بالغ یکے کے
 کہنا عیب ہونے کے علاوہ یہ معنی دیتا ہے کہ ابھی نا سمجھ ہیں۔ نادان
 ہیں۔ اس لیے اس پہلو کو بچا کر مختلف طریقوں سے اس جملہ کو ادا کر دیتے
 ہیں۔ مثلاً یہ کہیں گے کہ آج کل میں دودھ استعمال کرتا ہوں یا آج کل

میری غذا دودھ وغیرہ ہے۔ بہر حال کئی خوش طبع اہل قلم لفظی جوڑ توڑ اور معنوں کے الٹ پھیر سے طرافت کا رنگ پیدا کرتے ہیں جن کے مزاج میں شگفتگی ہے اور زبان پر پورا پورا قابو حاصل ہے وہ تو میدان طرافت میں طرار سے بھرتے رہتے ہیں در نہ آرٹیل گھوڑے کی طرح قدم قدم پر اڑتے ہیں اور بد بگائی کرتے رہتے ہیں۔

طرافت کے سلسلہ میں اگر ہجو اور رخصتی کا ذکر خیر نہ کیا جائے تو اس طرافت کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے اور تمسخر کا بازار تو بالکل چو پٹ ہو جاتا ہے۔ ہجو کو پست اور گری ہوئی صفت سمجھتے ہیں مگر اس کا ٹانگ ہمیشہ اوپر ہی رہتی ہے۔ ہجو کی بنیادیں ذاتی عناد اور باہمی چشمک پر رکھی گئی ہیں مگر آخر میں چل کر اس کے ڈانڈے طبر و طعن سے ملتے ہیں جو طرافت کی جان اور خوش مذاقی کی روح رواں ہے۔

ہجو میں رمز و کنایہ، ضلع جگت علامت اور حصہ ابہام اور ابھر تحسین غرض کہ طرافت کے تمام اجزاء کا استعمال بڑی دریا دل سے کیا جاتا ہے بلکہ بعض اہل قلم تو خوش ہیں اگر تو مکار گالی گلوچ اور فحش کلامی کے دریا بھی بہا دیتے ہیں آپ کسی کی ہجو بھی اٹھا کر دیکھ لیجئے تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ اسی خام میں سب ننگے رہنا وہ گلفشائیاں کی ہیں کہ جانڈوں کو بھی مات کر دیا ہے۔

مگر آج کل تو ایک طرف طرافت نے اپنا رنگ بدل دیا ہے۔ اور دوسری طرف تعزیرات ہیکہ کی دفعہ نے ہجو گویوں کا تاقیہ تنگ کر دیا ہے اب تو بہترین قسم کی ہجو وہ ہے جس میں اپنے حریف کا کمزوریوں اور عیبوں کو دلچپ اور طریقانہ رنگ میں دکھایا جائے خوشگوار شوخیاں۔ چست اور چلتے ہوئے فقرے ہوں،

چھکشی ہوئی پھبتیاں ہوں، طنز کی جوتیں ہوں ذہنی داد پہنچ ہوں۔
 ظریفانہ پستیرے ہوں، دشمن پر ضرب پڑے اور کاری پڑے مگر ادلی
 خصوصیات پر ضرب نہ پڑنے پائے اور مذاق سلیم پر بار نہ گزرے طنز کیلئے
 یہاں ہجو ہے اگر وسعت نظری کو کام میں لائیں اور بجائے شخصی نمونوں پر ہاتھ صاف
 کرنے کے اپنے اور سماج کے عیبوں کو ایسے خوشگوار انداز میں ظاہر کریں کہ ہنسنے
 والے خود اپنے عیبوں پر ہنسیں اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ کریں تو ہر سمجھ
 لودہ ہجو نہیں طنز ہے، ہجو اور طنز کے نمونے دیکھنے ہوں تو سودا کا کلام دیکھتے
 اسلئے اس فنڈ میں ورق کے ورق سیاہ کر دیئے ہیں۔ سودا اور دو کا پہلا نشانہ
 ہے جس نے ہجو اور طنز کے میدان میں سب سے پہلے قدم رکھا اس کی شگفتہ مزاحی
 اور بلند خیال کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے شدید سے شدید غصے کے جذبات پر ایک
 نقاب سی ڈال دیتا تھا کہ اپنی مرمت کے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی تفریح ہوتی
 رہے اور موقع موقع سے ذرا نقاب کو چہرے سے ہٹا دیتا تھا کہ تاکہ اصلی
 واقعات بھی ظاہر ہوتے رہیں۔

سودا نے گھوڑے کی ہجو کہی ہے اس کے دو چار شعر سنئے

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی ہر باں

بادے نرا جو ان کا کوئی نام لے نہاد

فکر میں سو روپیٹے کے دیانت کی راہ سے

گھوڑا رکھے میں ایک سواتنا خراب خوار

مانند نقش نعلی زمین سے بجز قنات

ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر ٹیٹھ ایک بار

ہر رات اختروں کے تیس دن روز پوچھ کر

دیکھتے ہیں آسمان کی طرف ہونے والے قرار

ہے اسی قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے
 منجھیں گرا اس کی تھیاں کی ہودی نہ ہستوار
 گھوڑے کی عمر کے متعلق فرماتے ہیں کہ
 ہے پیر اس قدر کہ جو تھلائے اس کا سن
 پہلے وہ لے کے ریگ بیاباں کرے شمار
 لیکن مجھے تو روئے تواریخ یاد ہے

شلیان اس پہ نکلا تھا جت سے ہو سوار
 یہ اس گھوڑے پر بیٹھ کر لڑنے لگے تو اس طرح تھویر کھینچتے ہیں کہ
 جا بک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا ہنہ میں باگ
 لک لک سے باشعہ کے میرے پاؤں تھے نگار
 آگے سے تو بڑا اُسے دکھلائے تھا شیش
 مجھے نقیب پانکے تھا لاشی سے بار بار
 اس منہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
 اکثر مدبروں میں سے کہتے یوں وہ لپکار
 پیسے اسے لگاؤ کہ تا ہو دے یہ رواں
 یا بادبان باندھو بون کے در اختیار
 کہتا تھا کوئی ہے نہ کوئی ہیں نہ الب
 کہتا تھا کوئی ہے گا ولایت کا یہ خمار
 کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
 کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار
 دھولی کہہار کے گدھے اس دن ہوئے تھے
 اس عاجزے کو سن کیا دونوں نے داں گزار

ہر اک نے اس کو اپنے گھرے کا خیال کر

پکڑے تھا دھولی کان تو کچھ تھا دم کھار

جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل پڑے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا نعل میں یار
دھردھمکا داں سے کرتا ہوا شہر کلن پڑا لقمہ گھر میں ان کے میں نے بھی قرار
یہ تو تھے طرافت کے چیلے چپاڑے اور دم چھلے اب خوش مذاقی اور

طرافت کا پوسٹ مارٹم کیے تو پتا چلے گا کہ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں
مسکرائے پھرتا ہے کہ خوش طبعی، طرافت اور محبت کا نام ہے خوش طبع
شخص کو بنی نوع سے دل خلوص اور پھری ہمدردی ہوتا ہے۔ ہر طراف
اس کے طرافت خوش طبعی اور ذہانت کا نام ہے یہ زیادہ نفی ہے اور
اس میں غصے کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو برف کا ہستی ہوا شکل میں
تبدیل کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

ظریف اپنے چھتے ہوئے فتردوں اور طنز یہ جملوں سے ایک ایسی
فضاء پیدا کر دیتا ہے کہ بے تعلق لوگ ہستے ہستے لوٹ جاتے ہیں اور
جہنی ذرا بھی تعلق ہوتا ہے وہ دل ہی دل میں روتے ہیں۔ ظریف کے
دل میں انتہائی جذبات بادلوں کی طرح اومٹھتے رہتے ہیں اور آنکھوں
میں شوخی اور شرارت سے بجلی کی طرح جھلکتی رہتی ہے وہ ہماری اندرونی
کنزوریوں اور حماقتوں کے گھراٹیوں کو اچھی طرح مطالعہ کر کے خوش
طبعی اور طرافت کی رنگ برنگ کی خوش ناروشنیوں میں دکھاتا ہے اور
جن باتوں پر یار لوگ پیٹ دیا دبا کر تھپتھپاتے ہیں اُس پر ظریف
ہو نہٹ دبا کر مسکراتا رہتا ہے طرافت کے نمونے دیکھتے ہوں تو اودھ پنچ
ملاحظہ فرمائیے اُس کے پرانے کھنڈر میں سینکڑوں تھپتھپاتے رہے
پٹے ہیں اودھ پنچ کے نام نگاروں میں ایک سے ایک اعلیٰ ادیب

اپنی ایک خاص طرز کا موجد اور طرافت کا امام تھا۔ خود نقی سجاد حسین ایڈیٹر
 ”طرافت“ کے سرچشمے تھے۔ مرزا محمد بیگ ستم ظریف حضرت احمد علی شوق
 بندت رتن ناتھ سرشار، پنڈت ترہون ناتھ، بکر، نواب سید محمد آزاد،
 بابو جوالا پرشاد برقی اور اکبر الہ آبادی سب کے سب مسلم البقوت استاد
 اور طرافت نگاری میں اپنی نظر آ پاتے تھے۔ ”دودھ پنچ“ اردو ادب کا پہلا
 پرچہ تھا۔ اس نے طرافت کے چہرے سے نقاب اٹھائی اور
 دنیائے ادب میں طرافت کی اہر دوڑادی۔ اس کے سب نامہ نگار پرانی
 تہذیب و تمدن کے ڈنکے پیسے تھے اور نئی روشنی کے خلاف لٹھے کر
 گونے پر پڑ گئے تھے سرید کے خلاف خوب گلشنیاں کیں۔ داغ اور
 مولانا حالی پر بڑھ بڑھ کر دار کیئے اور طرافت کے شہسوار بدقوتوں
 پانی پت کے میدان میں طرارے بھرتے رہے ہر معرکہ کا عنوان رہتا تھا۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا ہال ہے

میدان پانی پت کا طرح پائیال ہے

تعلیم نسواں اور پردے کے سلسلے میں اکبر نے جو بے پردہ چوٹیں
 کیں اس کا ایک قطعہ غوثاً ملاحظہ فرمائیے۔

بے پردہ کا جو آئین نظر چند بیبیاں

اکبر زمین میں عزت تو کیا سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا

کہتے گئے کہ عقل پہ مردوں کے چڑ گیا

اگر دیکھا جاوے تو دودھ پنچ کی طرافت بھی اعلیٰ قسم کی طرافت

نہ تھی جبکہ برز نرائین چکیت ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

تو مومن کے مذاق سلیم نے جو طرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔

اس کے دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کا طرانت کو بہت مجموعی، اعلیٰ درجہ کی طرانت
 نہیں کہہ سکتے لطف طرانت اور نڈمہ ستمی اور تسمیر کا بہت فرق ہے اگر لطیف
 و پاکیزہ طرانت کا رنگ دیکھتا ہے تو اردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطوں
 پر نظر ڈالنا چاہیئے۔۔۔ اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طرار طبیعت کا
 رنگ دوسرا ہے اُن کے تلم سے پھتیاں ایسی نکلتی ہیں جسے کمان سے
 تیر۔۔۔ جو مظلوم اُن تیروں کا نشانہ بن سکتے رہتا ہے اور دیکھنے والے
 اس کی ہلکی پر روتے ہیں۔ اُن کے نقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں
 لیتے ہیں بلکہ نشر کے طرح سر جاتے ہیں اُن کا ہنا غالب کا زیر لب مسکراہٹ
 سے الگ ہے یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے تہقے لگاتے ہیں اور دوسرے
 کو بھی تہقے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔

سرشار کی شوخی :- پنڈت رتن ناتھ سرشار ابتداء میں اودھ
 پنچ کے نامہ نگار تھے پھر کچھ عرصے کے بعد خود اپنا اخبار جاری کیا جو،
 اودھ اخبار کے نام سے مشہور ہے طبیعت میں ہلاک شوخی تھی۔ لکھنؤ کی
 شکسالی زبان لکھتے تھے ان کا سب سے بہتر تعریف "فسانہ آزاد ہے جس میں
 ہر طبقہ اور فرقہ کے حالات اور محاورات بڑی خوبصورتی سے لکھے ہیں اور بڑے
 ظریفانہ انداز میں پیش کیے ہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک انیولن کے مالا سٹے
 بازار بھر میں سنا، علوائی بھی سو رہا ہے مگر نان بائی برتن دھو رہا
 ہے جو پیروں کی دوکان میں قفل لگا ہوا ہے۔ مگر تمباکو والا جگا ہوا ہے۔
 ادھر صدا ہے مرغ سحر اُدھر ندائے اللہ اکبر۔۔۔۔۔ اسٹے میں کیا دیکھتے
 ہیں کہ ایک شخص لنگی باندھے انیولن کا پینک میں جھوم رہا ہے اور بو کھلایا ہوا
 جو طرزہ جھوم رہا ہے کہ کہیں سے ایک چکاری مل جائے تو دم لگے جہاں لگے
 میں پھر آنا کی آواز آتے ہے الغرض محلے والوں کی علوائیں سناتے

اور دل ہی دل میں جھلاتے پھوٹے نان بالی کی دکان پر حضرت پہنچے حضرت
 بڑے بھالہ! اک ذری آگ تو جھٹ دنیا میرا یار لا تو جھٹ پٹ۔
 نان بالی۔ اچھا اچھا تو دکان سے الگ رہو۔ یہاں سودھنے
 کرتے ہیں آپ کی طرح کوٹ بے نکرا تو نہیں ہے کہ ترٹا ہوا اور چلم لی اور لگے
 کوڑی دکان مانگنے۔

صبح صبح اللہ کا نام نہ رسول بنے سے کام چلم لے دکان پر ڈٹ گئے۔
 ایسے ہی اچکے تو جوری کرتے ہیں آنکھ چوک اور مال غائب کا سہل لیک چکر
 چلم لے کر آگ مانگتے آئے ہیں۔ کسی حقہ میں چلم دلم نہ توڑ کے پھینک
 دوں گا۔ تم ترٹ کے دکان پر نہ آیا کر دبی۔ یہی مفت میں کسی دن،
 ٹھائیں ٹھائیں ہو جائیگی۔

حضرت کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا جی چاہا کہ بھی میں سر کھونس
 دیں مگر سوچ کہ ہم ایسی آدمی و نان بالی گوشت پرائے کھا کھا کر کے
 کتے کی طرح پھول گی ہے ایسا نہ ہو کہ ایک شخصنی تباہے وہاں سے چلے تو حلوئی
 کی دکان پر پہنچے۔

حضرت۔۔۔ میاں ایک ذری سی آگ دینا بھال ہوت! اسی وقت حلوئی کا دودھ بلی پل گئی تھی۔ جھٹلایا بیٹھا تھا گھبراہٹ میں سمجھا
 کہ کوئی فقیر بھیک مانگنے آیا ہے کڑک کر اور جھڑک کر بولا اور دکان دیکھو
 سویرے سویرے کوڑی کی پڑ گئی جاتا ہے کہ دوں دھکا رہیں کہیں،
 میں کہیں، کوڑی مانگنے یہاں موجود اب کھڑا گھورتا ہے کیا؟ دونوں
 پھوڑ نہ ڈالوں میں۔ حضرت۔ کچھ دہی ہوا ہے بے۔ اے ہم کوئی فقیر
 میں میں ایک کھس بی نہ تباہا بچہ لوصاحب ہم تو آگ مانگنے آئے ہیں
 اور یہ ہم کو بھیک منگا بتاتا ہے اندھا ہے اندھا ہے بے، حلوئی دکان

سے اتر کر۔ بھیک منگاتا میں تو ہے کون؟ لنگولی باز دھل اور پلے
 بھیک ملنے تہارے بابا کا کرج دھراؤت ہے۔
 یہ چلے سے کان دباٹے چل کھڑے ہوئے..... اتنے میں دیکھا
 کہ ایک سنار کی دکان پر آگ دھک رہا ہے۔۔۔ اتفاق سے اس وقت
 سنار دکان پر نہ تھا..... جھپ سے دکان پر چڑھ گئے ان کا چڑخا
 تھا کہ سنار بھی آگیا اور ان کو دیکھ کر آگ بھبھوکا ہو گیا۔ تو کون ہے بے
 دیکھو بے تہ نہ کرنا۔ سنار نے جھٹلا کر ایک چت جلائی۔ اب تو کون
 اور سیٹھے صاحب۔ خالی دکان پر کیا مزے سے چڑھ گئے اور ایک دھپ
 جا کر اور جو کوئی عدد دیا تار تھا۔ میاں آنیچھی نے دیکھا کہ اس نے این بائیں
 کاسر پنچوں کا سر مقرر کیا۔ مٹا چلم پھینک کر سامنے کھڑے ہوئے بھلا
 اب تو ہاتھ چلا..... اس نے بڑھ کر ایک چاٹھا اور رسید کیا اور
 لے گا اتنے میں تیس چالیں آدمی جمع ہو گئے۔ کیا ہے میاں کیا ہے؟
 ہے کیا یہ ہماری دکان پر چور کا کرنے آئے تھے ہم نے گردن ناپی تو میں چور
 کرنے آیا تھا۔ میں چور ہوں چور کی ایسی ہی صورت ہوتی ہے۔

لوگ۔ کون تم ہیں تو تم شاہی چور معلوم ہوتے ہو کالی جوری۔
 اچھا بھرت تم ان کی دکان پر گئے کیوں؟ دکاندار نہیں تھا تو تمہارا کیا کام
 اور جو سونے چاندی کا گھناٹا بھاگتے تو یہ تمہیں کیاں ڈھونڈتے پھرتے؟
 بہر حال اگر کوئی۔ ظرافت کے درشن کرنا چاہیے تو پہلے اسے
 ادھ پیچے کے ٹوٹے کھنڈ روں کی زیارت کرنا نہایت ضروری ہے۔
 خوش مذاقی، خوش مذاقی کے تعلق سے میں نے پہلے عرض کیا
 تھا کہ وہ ظرافت اور محبت کا نام ہے خوش مذاقی کی ہنسی اصلی ہنسی ہے
 جس سے فرحت اور لبلاشت پیدا ہوتی ہے وہ ہمارے عیبوں کو اس

خوب سے ظاہر کرتا ہے کہ یار لوگ سچا کر خود اپنے بیسوں اور اپنی کمزوریوں پر ہنستے ہیں اور ان کی اصلاح کرنے کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

خوش مذاقی کے مفہوم کو عظمت اللہ خالق اس طرح سے سمجھایا ہے کہ آپ ایک معمولی سا مضمون لکھیں اس سرخ سے ”ایک ٹپے کی سرگزشت“ اور اس کو اس طرح لکھیں کہ پڑھنے والے یہ بھی مانتے جائیں کہ آپ نے ٹھیک لکھا ہے اور ہنستے بھی جائیں۔ اگر آپ کے دل و دماغ پر ایک انبساط کی کیفیت چھا جائے اور کبھی کبھی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل جائے اور ایک مرتبہ تاریں پھول کی طرح کھل کر ہنس پڑیں تو ایسا مضمون خوش مذاقی کا بہترین نمونہ ہوگا۔ خوش مذاقی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رکاکت اور سوتیانہ پن بالکل نہ ہو اور منطقی پشیرے اور داؤد بینچ کیلے ایک پُر لطف درزش ہو جائے اس قسم کے مضمون لکھنے والوں میں مرزا فرحت اللہ بیگ، پطرس رشید احمد صاحب صدیقی، غلام بیگ جغتائی، ایم اسلم، سندباد جہازی اور شوکت تھانوی اور ملازمیوزی بہت مشہور ہیں۔

حسنِ بیاں کے نمونے: اگر آپ سلاست زبان اور حسنِ بیاں کے چٹنارے لینا چاہیں اور رقم نگاری کے دلچسپ نمونے یا ہناری، قدیم تہذیب و تمدن اور پرانے لوگوں کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھنی چاہیں تو مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون پڑھیں ان میں ظرافت کے ساتھ ساتھ کیاست اور ذہانت بھی ہے اور مصوری کے بہترین نمونے بھی ہیں۔

اگر فرانسیسی ادب کا جھلک دیکھنا چاہیں تو پھر پطرس کے مضمون پڑھیں۔ ڈالنے ان کی محنت میں آپ معمولی معمولی باتوں پر،

غنتے پر ہونے لگے۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو خوش طبعی کی رنگ بزم نگار
روشنی ڈال کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ غنتے غنتے پیٹ میں ہل پڑ جاتے
ہیں۔ اگر آپ کو کافی فرصت ہے اور محبت کو فخر نگاری سے کچھ لگاؤ
تو۔ رشید احمد صاحب کے مضامین لے کر بیٹھ جائیے پھر ان کے
منطقی پتیرے دیکھئے کس کس خوبی سے کدلی چلاتے ہیں۔ اور چوٹ پر
چوٹ لگاتے ہیں۔

اگر آج سے سو دو سو سال کی اردو دیکھنا ہو تو مولانا موزنی کی
گلابی اردو پڑھو بڑی خوبی اس میں ہے کہ اگر ان الفاظ کی جگہ آپ آنکھ نہ
کر کے عربی الفاظ رکھو بھی تو وہ پکی کے شریف کی عربی ہو جائیگی
اور خالی پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے کعبیت میں بیٹھے جبار ہیں
گلابی اردو سے فرصت ہے تو پھر ان کی شبیلی اردو کا مطالعہ کیجئے۔
اس میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اُسے پڑھ کر نیکھے پڑھ بھی لالہ اُٹھاتے
ہیں اور باہل بھی مزے لیتے رہتے ہیں۔ علمی چاشنی بھی ہے اور آرازی زبان
کے چٹخارے بھی ہیں۔

اگر خیالی منصوبوں اور خیالی آرائیوں کا لطف اُٹھانا ہے تو شوکت تھانی
کے مضامین پڑھ جس طرح منظر نگار اور قدس گلکاریوں کو دیکھ کر بوقلم
سے زنگ بھرتا چلا جاتا ہے۔ بس اسی طرح یہ بھی جو دیکھتے ہیں اپنے کلک
ظرافت رقم سے تصویریں کھینچنے چلے جاتے ہیں ان کی تحریر کی عکس تصویر
میں ہوتی ہیں حسن میں سارے اور روشنی کی جگہ برجستہ چلے جاتے ہیں اور
ان میں ظرافت کا رنگ مناسب رہتا ہے۔

اگر سیدھی سادی اور پمکی ہوئی ظرافت کا مطالعہ کرتا ہے تو
چغتائی صاحب کے مضامین پڑھ یہ اپنے فائدان اور عزیز واقارب سے

ایسے ہی رہتے ہیں جسے رخت سے اسی طرح جو بھی واقعات اپنے گھر
 میں دیکھتے ہیں انکے ڈالتے ہیں اور جو زبان آئی ہے تکلف بول جاتے ہیں۔
 مرزا فرحت اللہ بیگ کی گھوڑ دوڑ ملاحظہ فرمائیے۔

یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہو گا کہ دم پر تندرہ باندھنے اور
 دم دبا کر بھاگنے کے محاوروں کی اصلیت کو گذشتہ گھوڑ دوڑ میں ایک
 نئے گھوڑا پیدا دنا میں نے ظاہر کر دیا۔ ان دونوں محاوروں کو منسوب ہمیشہ
 بے تحاشہ جگالے جاتے ہیں۔ لیکن کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ دم پر
 تندرہ باندھنے یا دم دبانے سے رفتار میں تیزی کیسے پیدا ہو سکتی ہے اس
 گھوڑ دوڑ میں ایجاد کے زمین کا تندرہ بھی آگیا اور دم دب بھی گئی۔

پچھلے دنوں خواجہ حسن نظامی صاحب نے جوگوں کو حفظ کی غلطیوں سے
 بچانے کے لیے آمد میں کچھ تھروٹا تکیے تھے۔ مثلاً وہ مدت تک دلی کو ذرا ہی
 دیکھتے رہے اس میں کتاب یہ تھا کہ ذلی یعنی داستان ہے۔

خاکسار نے اس مصرع پر دوسرا مصرع لگا کے مطلع بتایا یعنی بلی
 کو بلی کی بھنا شروع کیا کیونکہ دلی کو جو تعلق دلا ہے وہی بلی کو بلی سے
 ہے کہ کم بخت بلی کے بل صاف کر جاتا ہے بندل تو بیجا ہو ہی گیا تھا تھوڑی تھوڑی
 دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچے ہو گئی اور میں ہمہ تن زمین پر پہنچ گیا۔ ایک
 لڑکے نے کہا دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے گویا اس بد تمیز کے نزدیک میں کوئی
 کرتب دکھا رہا تھا..... شکل سے میں قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم
 ہوا جیسے زمین یک لخت اُچھل کر مجھے آگئی ہے آسمان میرے سر سے
 ہٹ کر میری ٹانگوں کے نیچے میں سے گذرتا گیا ہے اور ادھر ادھر کی
 عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنا اپنا جگہ بدل لی ہے۔ جو اس
 بیجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں گویا

بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا..... میں نے اپنے گرد و پیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکی کا انگلا نہیں بائیسکی ہو کر لڑا ہکتا ہوا شریک کے اُس پار پہنچا ہے۔ اور بائیسکی کا باقی حصہ میرے پاس پڑا ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا، جو پیسہ الگ ہو گیا تھا۔ اُس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ بائیسکی کو تھاما اور چل کھڑا ہوا.....

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا اپنے آپ سے پوچھا کہ یہ تم کیلئے ہے ہو کہاں جا رہے ہو۔ تمہارا ارادہ کیا ہے یہ دوسرے کلبے کو ساتھ لے جا رہے ہو سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھنا جائے گا۔ نئی الحال تم ہاں سے چل دو سب لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اور نچار کھو اور ملتے چلتے جا رہے ہیں۔ اُنہیں ہنسنے دو اس قسم کے ہیو وہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں آخر ہو ایک محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو ملتے جاؤ۔ لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سننا دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی، بس حضرت غصہ تھوکی ڈالیئے ایک دوسرے صاحب بولے بے جا بائیسکی، گھر پہنچ کر تجھے مزہ چکھاؤں گا۔ ایک والد اپنے لبت بکر کو انگلی پکڑے لیٹے جا رہے تھے، میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے دیکھا بیٹا ایسے سرکس کی بائیسکی ہے اس کے دونوں پسے الگ الگ ہوتے ہیں.....

عظیم بیگ چغتائی نے کس خوبی سے عربی کی ٹانگ توڑی ہے فرماتے ہیں بھائی شہرزی نے کہا ارے میاں عربی بولنا اور سمجھنا تو بہت آسان ہے کچھ نہیں صرن معمولی اردو میں نیل، دل، ال اور کم وغیرہ لگا دو، بس عربی ہوگی عراق میں ایک ناؤ ایسی بھی ہوتی ہے جیسے گول پیالہ... ہم دونوں ناؤ میں بیٹھ گئے اور دریا کی سیر ہونے لگی۔

جو دھری صاحب ملاح سے غلط سلط عراقی اردو بولی رہے تھے۔
 چونکہ لفظ عیسق جانتے تھے لہذا تمام دریا کی گہرائی پر گفتگو ہو رہی تھی اب
 ملاح سے انہوں نے اُس خونناک بھنور کی طرف انگلی اٹھا کر کیا غریب کشتی
 میں انگر داب ہے پر لفظ گرداب پر انگلی سے بھنور کی شکل بنائی اور
 بھنور میں ناؤ لے جانے کا اشارہ کیا..... ملاح نے تیزی سے کشتی
 لے جا کر گرداب میں ڈال دی..... اب جو دھری صاحب چکراٹے چاہے
 خود انہوں نے ڈنگمگاتے ہوئے ملاح سے کیا اپنا شیخ شدہ المن الرقص
 اخراج علی الگرداب۔ بانگر و ملاح واللہ اعلم سمجھنا بھی ہو گیا نہیں کہ
 فارسی میں بھنور کو گرداب کہتے ہیں..... اس نے نہ سنا اور نہ سمجھا
 اور نہ سمجھنے کی کوشش کی اور اللہ کا نام لے کر دانتوں سے اپنا ہونٹ
 دبا کر اباغ کی۔ پھر روز سے پتوار پانی میں ڈال کر ناؤ کو اور بھی گھن
 چکر کر دیا.....

میں سمجھ سے میں پڑا چلا رہا تھا خدا کے واسطے نکالو ارادہ راہ
 اشتری بولکھلا کر چلائے شدہ المن الرقاہ لے اسیمار شیخ "خدا کے
 واسطے اخراج میں اگر داب ارے ملا میں پھر چلایا ہاٹے مرا ارادہ اس
 ناہنجا ملاح نے ایک مرتبہ اور پانی پتوار ڈال کر روز سے چکر کی تیزی میں
 اضافہ کر دیا..... جو دھری صاحب نے اب تو وہاں سنائی دینا شروع
 کر دی اور چلا رہے تھے اے! نالائق شیخ برجنک..... کم بخت
 اشوس الرقص..... ارے رقص..... ارے اخراج.....
 من الگرداب..... ارے موزی..... ناؤ نکال.....
 زسیا شیخ..... اے الو..... ابن الماتو..... قسم خدا کی.....
 ورنہ ارے بھائی شیخ شدہ المن الرقص..... اے روک.....

ناتق..... بد معاش مگر تو یہ کہتے بھلا ان باتوں سے کہیں باز رکھنے والی تھی..... سر ٹپک ٹپک کر ہم دونوں بے ہوش ہو گئے نہ معلوم کتنے دیر بعد آنکھ کھلی تو ہم نے اپنے آپ کو دریا کے کنارے پایا جب ایک فارسی داں حضرت کا ادھر سے گزر رہا تھا معاملہ صاف ہوا ادھر اشد ری نے علاج کی شکایت کی ہم دونوں کو اس نے جرح دے کر ادھر ہوا کڑواں ادھر علاج نے کہا کہ ایسے لوگ بھی کلمہ دیکھتے ہیں۔ آٹے ہیں کہ مارے چکر کے مرے جا رہے تھے مگر بار بار بھی بولتے تھے کہ ناو کشتہ کے ساتھ رتوں کراؤ میرا خود سر چکرا گیا اور دگنی مزدوری واجب ہے۔ اب شوکت تھانوی کی کارگزاری ملاحظہ فرمائیے: آج کا موضوع شاپکار ہے..... اس لفظ کے معنی ہیں کاموں کا بادشاہ اس لئے کہ کار کتے ہیں کام کو اگر کار کے معنی موٹر کار لئے جائیں تو شاہ کار کے معنی ہوں گے۔ مٹر فورڈ لیکن چونکہ یہاں اردو زبان کے لفظ کار سے بحث ہے لہذا اس کار کے معنی ہیں کام اور جب اس میں شاہ لگا دیا گی تو یہ ہوگی شاہ کام یعنی کاموں کا بادشاہ اس کو اسی طرح سمجھو کہ قلاتم نے..... اپنی ہوال بندہ وق سے ناخستہ مار ڈالی اس ناخستہ کے شکار کو تم اپنا شاہ کار کہہ سکتے ہو اس لئے میرے شاہ کار تم خود ہو۔

جہاں گاندھی کا شاہ کار چرخیہ ہے۔ مولانا محمد علی کے شاہ کار مولانا شوکت علی ہیں۔ انگریزوں کا شاہ کار کنگ پرائیڈ ہے۔ ہندستان کا شاہ کار تاج محل ہے۔ تاج محل کا شاہ کار مولانا سیاب کے شاہ کار ساغر نظامی

پشردلیم کا قحط ایک معنی تو پشردلیم کے کال کے ہیں اور دوسرے

علیحدہ علیحدہ معنوں میں یعنی پیئر معنی پیٹر دگرڈ اور دوسرا (میتیر) دلیم سب کا فہم یہ رہا کہ جرمنی اور روس دونوں غائب۔

ملازموزی کی گلابی اردو کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے:- پس یہ سلسلہ کلام ہمارے کیا پہونچا اور اس جگہ کے تو شریف لائین بیوی۔ نمبر ۲ ہمارے ساتھ ہر بالی بہت کے اور فرمایا کہ اے شوہر میرے دراز کرے اور عمر اور قدرتی آپکی مگر اے عجب وہ گھڑی محبت کی بڑھانے والی کہ جب لائین الف بیوی۔ نمبر ۳ ہماری ساتھ محبت اسی کے کہ بیوی چونٹا اس پر ہر کلکتہ اور دہلی اور باتیں کیں انہوں نے ایسے باتیں اور پر والی تو کہا ہم نے کے اے بیوی نمبر ۳ ہماری، تحقیق قربان ہوئی اور پر دنا داری ستری کے چالیں خزانہ یا عرائین کے۔

اور شوق دے اور ہندوستان کو دیسی مصنوعات کا اور شوق دے اور رشوت خوار تھانے داروں کو گانج پیئے کا اور شوق دے اور پردہ دار عورتوں کو پردے کا، تانہ جھانکتی وہ گانگوں، موٹروں اور ڈریسینوں پردہ دار سے ذلیل ہوتی ہے جھانکے ان کے سے شہرت خاندان ان کے کی۔

اے سینا میں جھانکنے والو!

نہ چاہیئے رتبہ نہ چاہیئے تم کو یہ کہ جھانکو تم بیچ سینما کے طرف پردہ نشین عورتوں کے کہ تحقیق میں وہ عزت تمہاری اگر چہ یہ سب جہالت سخت کے غافل ہیں۔ مسلمان ترقی اور تعلیم عورتوں انہیں سے۔ ناگاہ کبھی ایک ہوائی جہاز کے لئے شریف بیچ خدمت نیفی کے درجہ والی ہماری کے۔ مصلیٰ نوزی بادشاہ وزیر جنگ حکومت ترکی کے پس بعد جلالی قاعدوں نظم کے سگریٹ ترکی پلایا ہم نے ان کو اور حقہ سرحدی پلایا ہم نے ان کو اور کردے البتہ عبادت۔ حقہ نوشی کی سرحدی بھائیوں سے۔ اما بعد سوال کیا صفت کی گئی یہ کہ کیا سب اس کا کہ چار شادیاں کیں آپ نے درآن حالانکہ جتنی پیکار اولاد چوتی

ہے پچھلے ہندوستان کے، انہیں پیدا ہونے لگے تھے دینا تمام کے ... یہ کہنا ہم
 نے کر نہیں ہے کوئی شک ہے اس کے چار بیویاں کیں ہم نے یہ سب انہماک کے
 تاغم انہماک کا غلط ہو ذریعہ ان کے کیونکہ تحقیق نہیں ہے اس قدر ڈھیل پڑ گئی
 تھی۔ بعد والدین کے پچھلے دینا کے مونس زیادہ بیویوں چار سے نہ بیوی ایک
 سے اگر محفوظ رہیں وہ اوناد زیادہ سے پس بشارت اور خوش خبری ہے
 چار شادیوں کے اگر سینما نہ دیکھیں چار بیویاں ایک شوہر کی۔
 کچھ مہری بھی طراندہ کا رنگ ملا خطہ فرمائیے! حکیم جی کشمری شملہ
 زبیا کہتے تھے جس کی بندش سرالی بلکہ پیو انصوبہ جاتی ہوتی تھی دو چار ہاتھ
 جو دھ پوری میں تو دو نہیں جے پوری اچھلا حصہ مار ڈاڑی ہے تو اگلا بھولی
 تو کچھ مدار کی ہے تو کچھ پنجابی ہے غرض کہ چوں چوں کا مرہ تھا جو قیم کی
 شکل میں سر پر دھرا رہتا تھا اس پر طرہ یہ کہ منڈا سے کا ایک سرا اگر طلاس
 کی کٹنی کی طرح سر سے ایک نٹ بلند ہو کر طرہ امتیاز بنتا تو دوسرا پس
 پشت شملہ بن کر مقدار علم ظاہر کرتا رہتا تھا وہ جب چاہے اس کو سر سے
 اتار پاتا تھے میں کچھولی کی طرح رکھ لیتے اور جب چاہتے سر پر لٹ لیتے مگر اس کی
 بندش تاروں اور تاروں میں بال برابر بھی فرق نہیں آتا تھا۔ سر کے بال بڑے
 تھے مگر آفر زمانہ میں کچھ تو حجام کی تراش تراش اور خود ان کی بے رخی سے
 پد پد کا تاج بن کر رہ گئے تھے۔ ڈاڑھی لانی اور گھنٹی تھی دور سے
 دیکھنے پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ چہرے کے گرد توس قزح نکلی ہوئی ہے۔ اس کی
 بڑی وجہ یہ تھی کہ حکیم جی دسویں بار ہویں خضاب لگاتے رہتے تھے۔ مگر
 ساتھ ہی کسی ایک خضاب کے پابند نہیں تھے اور ہر چہ آید در گھٹ کے اصول
 پر ملتے تھے ظاہر ہے کہ ایک خضاب کا دوسرے پر کیوں رنگ نہ لگا۔ نتیجہ
 یہ ہوتا کہ ایک ہفتہ بعد ذرا ڈاڑھی بڑی تو اس کے شروع کا حصہ کا دور

ایک سپید جھالر کی طرح رنگ جاتا ہوا نظر آتا تھا اس سے ملا ہوا بھورا،
پھر کالا پھر سرخ اور آخر میں سرخی مائل مگر ڈاڑھی پر ہندی کی کارنگ
سب رنگوں کو دہالتا تھا۔ ہنرمیں ڈاڑھیوں اور کچلوں کے علاوہ باقی
دانت دکھانے کھٹا ہی دکھانے کے رہ گئے تھے۔ جن کا پتا دور دور اور نزدیک
سے یکساں چلتا رہتا اس سے دانتوں کھلنے کی کاتیاں

غالب کی ظرافت: لطف ظرافت یا مزاح کے پاکیرہ نمونے دیکھتے
ہوں تو غالب کے خطوں کو ملاحظہ فرمائیے ان میں نہ تو نقلی گورکھ دھند ہے
نہ ضلع جگت ہے۔ اور نہ بھٹاں ہیں۔ بلکہ صاف ستھرا پاکیرہ اور شستہ مذاق
ہے ہونٹ تھمتے سے ہل رہے ہیں مگر ہنر سے دیکھو تو پھول جھڑپے ہیں
غزل قلم سے جو لفظ نکلتا ہے ظرافت کی چاشنی میں ڈوبا ہوا جو سنبھلے
ہونٹ ہاٹتا رہتا ہے طبیعت کی شوخی الفاظ کے پردوں سے جھلکتی ہے
ظرافت کا ایک دریا ہے کہ بہتا چلا جا رہا ہے اور اس میں ادب عالیہ کی
موجیں اور فصاحت کی لہریں موجزن ہیں غونے کے طور پر
دو چار خط ملاحظہ فرمائیے۔ صاحب عالم بار برداری شاید شکمہ باشعور
میں لکھتے تھے جسے پڑھتے ہیں دقت ہوتی تھی۔ غالب نے لکھا۔

حضرات! لکھی ہوئی عبارت جو سمجھتا ہوں اس کا جواب لکھتا ہوں
جو کچھ مجھ سے نہیں پڑھا گیا وہ تعویذ باندھ کر رکھتا ہوں۔ اگر بغرض مالی
کبھی ملاقات ہوگی تو آپ سے دریافت کر کے پاسخ گزرائوں گا علاء الدین صاحب
نے غالب سے اپنے بچے کا تاریخ لکھنے کا فرمایش کیا وہ تاریخ لکھنے سے
دور بھاگتے تھے مگر دلی شکنی بھی نہیں جانتے تھے فرماتے ہیں۔

”تم سنخوڑ ہو گئے حسن طبع درار لکھتے ہو، ولادت فرزند کی
تاریخ کیوں نہ کہو اور نام تاریخ کیوں نہ نکالو۔ علاء الدین تری جان کی

قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخ نظم کر دیا تھا وہ لڑکا نہ بیبا مجھ کو اپنی
 دہم نے گھرا ہے کہ میرا اندر وح بیتا ہیں۔ نیر الدین جدر اور امجد علی ایک
 ایک قعیدے میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ تین قعیدوں کے متعلق ہوئے
 اور پھر نہ سبھل کے۔ جس کی بدست میں دس میں قعیدے لکھے گئے۔ وہ عدد ہے

بھی پرے جا پہنچا نا صاحب!

قسم خدا کی میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا اور نہ تاریخی نام ٹھونڈوں گا۔
 ایک صاحب کو لکھتے ہیں۔ اشعار تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں شقائق
 اشعار سے مجھے وہ بند ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا جھاٹ تھا بھی کرتا
 تھا خلعت پاتا تھا۔ خلعت موتوں بھی مسترد کی نہ عزلی نہ مدری۔ ہر لد ہجو
 میرا آئین نہیں پھر کیا لکھوں۔ بوڑھے پہلوان کو طرح پیچ بتاتے رہ گیا ہوں
 ایک مرتبہ غالب نے اصلاح دی اس کے خلاق عالم نے اسناد پیش
 کیئے۔ جواب میں فرماتے ہیں۔ ”میں نہیں کہتا کہ خواہی خواہی میری تحریر کو مانو مگر
 اس کھڑکے سے اور اس معلم سے مجھے کترتہ جانو عربی کا حرف اور ہے اور نازکی
 کا تاوہ اور ہے۔ سمجھو یا نہ سمجھو تم کو اختیار ہے۔ عقل کو کام فرماؤ، غور کرو اور
 سمجھو۔ عبد الوہاب غیر ذہن تھا، قتل برہان نہ تھا۔ واقف غوث انظم نہ تھے
 میں نہ یہ نہیں ہوں شمر نہیں ہوں۔ مانو یا مانو تم جانو۔

ایک جگہ فرماتے ہیں۔ ”مگر کچھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کون کا ربیوں
 مانگتے ہو پھر لکھتے ہو رباعیاں بھی، قعیدہ بھی معنی اس کے یہ ہیں تو جھوٹے
 اب کے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، دس دہر کی قسم، زند کی
 قسم، بازند کی قسم، استاد کی قسم، گرد گرد تھک کی قسم نہ میرے پاس وہ قعیدہ ہے
 اور نہ وہ رباعیاں یاد ہیں۔“

ایک جگہ روزہ نہ رکھنے اور روزہ بھلانے کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو پہلاتا رہتا ہوں
 کبھی پانی پی لیا کبھی حقہ پی لیا کبھی کوئی روٹی کا ٹکڑا کھایا یہاں کے لوگ
 بھی عجیب قسم رکھتے ہیں تو روزہ پہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ
 تو روزہ نہیں رکھتا یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ پہلانا
 اور چیز ہے۔

ایک موقع صاحب عالم کو قواعد وغیرہ سمجھا کر فرماتے ہیں۔ وہ میاں
 پانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکے جناب واسع صاحب فرماتے ہیں کہ
 بے مراد صحیح، اور نامراد غلط، ارے تیرا پتا ناس جاے۔ بے مراد اور نامراد میں
 فرق ہے جو زمین آسمان میں ہے نامراد وہ جس کی کوئی مراد، کوئی خواہش اور کوئی
 آرزو نہ آئے اور بے مراد وہ جس کا جسم نقوش دعا سے سادہ ہو۔
 ان مثالوں سے آپ کو اندازہ ہوگی ہوگا کہ کیسا صاف ستھری زبان ہے اور
 کس قدر ظرافت کی چاشنی میں ڈوبی ہوئی کہ ہم پڑھتے ہیں مسکراتے ہیں اور
 گھٹوں ہونٹ چاٹتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ادب کے یہ معنی ہیں کہ لڑکا،
 بچے بزرگوں کے ڈوبے مارے کوئی سچی بات ہنہ سے نہ نکال سکے اور
 جھک جھک کر بلا ضرورت سلام پر سلام کرے یہ دلیا ہوا ادب ہے جیسا کہ
 ایک بندر والا بندر کو سکھاتا ہے کہ ٹانگ اٹھا کر کھڑا رہے اپنا تھ جوڑ کر
 گردن نیچے جھکا کر سامنے روئے اور ایک اشارے کے ساتھ ڈگڈکا پر
 چڑھ بیٹھے یہ ادب نہیں بلکہ بے ادبی ہے اس میں لڑکے کو ریاکاری اور
 ظاہر داری کی تعلیم ہوتی ہے۔

کچھ نقلی ظرافت :- اب تک تو آپ نے ظرافت اور اس کے فائداتی
 رشتہ داروں کے حالات سننے اب کچھ نقلی اور جعلی ظرافت بھی سنی ہیں
 پھلکڑ پن اور تفسیر کے حالات بھی سن لیجئے اور سٹری منان کے کرتبوں کو بھی

ملاحظہ فرمائیے گالی گلوچ اور فحش کلامی اس کی جان ہے۔

مساقت، تہذیب اور ادب اس سے کوسوں دور رہتے ہیں اور لطافت زبان تو اس طرح غائب ہو جاتی ہے جیسے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

اپنی عقل کو بلاوجہ اور بے موقع ہٹانے اور قہقہوں کی طوفان اٹھانے کے سلسلے میں تنگ بندی اور زٹی قافیہ: تنگ بندی اور زٹی قافیہ کا مطالعہ تو ہر حال سے دو ہاتھ لگے ہیں۔ اس میں معنی اور مطلب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ بے تکلی بات بھی بانگ دی جاتی ہے اور سنسنے والے بے اختیار چسپاں پڑتے ہیں۔ بہر حال زٹی قافیہ کے استعمال سے اچھے اچھے شاعروں کے قافیے تنگ ہو گئے۔

زٹلیات کا بادا آدم: میں کہ جعفر زٹی زٹلیات کے بادا آدم تھے خود فرماتے ہیں کہ

زٹی تیری جعفر جھانگیر بند

زٹی گفتن اندر نوئی مرشد

جعفر زٹی عالمگیر کے زمانہ میں تھے۔ اور اپنے رنگ میں خوب کچھ تھے۔ بیجاپور کی تعریف فرماتے ہیں کہ

عجب شہر این شہر بے جاہراست

کہ ہر ہرج اوشل بھینا سرات

اس سلسلے میں بھانڈوں کا ذکر خیر نہ کرنا گویا ظرافت کو محال دیتا ہے۔ شلی مشہور ہے کہ سوتی ہے وہ مفل کہ جہاں بھانڈ نہ باشد جس مفل میں یہ نہ ہوتے وہاں اوس پڑ جاتی اور جہاں یہ قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے تو بیس سمجھ لو کہ دیوار تھمہ کھڑی ہوگی۔

قوی بھوگر۔ بھانڈوں کی ظرافت سستی اور بازی ہوتی تھی۔ ہر ہرج

چھوٹا عالم ہو یا جاہل یہ اس پر فخر کرتے ہیں کبھی نہ جوتے تھے اور بڑی بڑی
طرز چوٹ کر جاتے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ ان
بھانڈوں نے یہاں کی سوسائٹیوں میں عجیب و غریب کام کیے ہیں یہ یہاں کے.....
یعنی قوی بھجگو ہیں۔

دہلی کا سب سے پہلا بھانڈا کریملا مشہور ہے جو محمد شاہ کے ہند میں تھا
کسی بات پر ناراض ہو کر محمد شاہ نے حکم دیا کہ بھانڈوں کو ہمارے ملک سے نکل
دو۔ دوسرے دن بادشاہ کی سواری نکلی تو اوپر سے ڈھول بجے اور بھانڈوں
کے گانوں کی آواز آئی، تعجب سے سر اٹھا کر دیکھا تو کریملا اور چند بھانڈا ایک کھجور
کے درخت پر جڑے ہوئے ڈھول بجا بجا کر گارہے ہیں۔ سواری رکوا کر پوچھا
یہ کیا گستاخی ہے؟ اور ہمارے حکم کا اب تک تعمیل کیوں نہیں ہوئی؟
عرض کیا قبلہ عالم! ساری دنیا تو جہاں چاہ کے زیر نگیں ہے جایش تو
کیا! اسی لئے اب عالم یا لا کا ارادہ کیا ہے اور یہ پہلی منزل ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کبیر کی لڑائی میں شجاع الدولہ کو شکست ہوئی۔
آصف الدولہ کو لکھنؤ پہنچا کر خود شجاع الدولہ فیض آباد آگئے وہاں غم غلط
کرنے کو ایک جشن کی بھانڈا بھرے کیلئے حاضر ہوئے ایک بھانڈا نے کھڑے
ہو کر کہا مبارک مبارک ہمارے نواب صاحب جنگ سے واپس تشریف لائے
دوسرے نے کہا خداوندہ سلامت رکھے ہمارے نواب صاحب کیا آئے
گویا بھاگ آئے۔

جراعت کا مشہور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے کریملا بھانڈا کا بھجگو کی،
کریملا بہت رو دیا دوسرے روز نواب شجاع الدولہ کے دربار میں اس کا
بجرا تھا حیرت بھی موجود تھی کریملا نے وہاں پر زچہ کا سوانگ بھرا اور
ظاہر کیا کہ اس کے پیٹ میں بھینا گھسا ہوا ہے۔ دوسرے صاحب ملان بن کر

تشریف لائے۔ جھننے اور ملا میں دیر تک نوک جھونک رہی آخر کار ملنے جھٹاکر
 کپاارے نامراد کیوں غریب مالاک جان کو لاگو ہوا ہے جرات ہے تو باہر نکل
 کہ تجھے جلا کر خاک سیاہ کر دوں۔

ان کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہتے ہیں کہ کسی رئیس نے انہیں دو شالہ
 انعام میں دیا وہ دو شالہ بہت پرانا تھا ایک نقال نے اسے ہاتھ میں لے کر غور
 سے دیکھا۔ اور اس کو بڑی غور سے دیکھتا رہا۔

دوسرے نے پوچھا اب دیکھتا کیا ہے! کہا دیکھتا یہ ہوں کہ اس پر کچھ
 لکھا ہوا ہے۔ پوچھا آخر کیا لکھا ہے! اس نے جیب سے عنیک نکال کر لگا لگا کر ایک
 ایک کر کے بڑی مشکلوں سے پڑھا لا الہ الا اللہ پوچھا بس اتنا ہی؟ محمد رسول اللہ نہیں
 جواب دیا محمد رسول اللہ کیسے لکھا ہو۔ یہ تو ہمارے حضرت سے پہلے کا ہے ایک
 مرتبہ کھنڈ کے کسی نواب کے ہاں کھانڈوں کا مجرا ہوا یہ نواب صاحب گڑھیہ والے
 کے نام سے مشہور تھے اسمیئے ان کے مکان کے پاس ایک گڑھیہ تھی۔ محفل میں ایک
 کھانڈ گھرایا ہوا نکل کے سامنے آیا اور بے سہا تھیوں سے کہا اٹھو اٹھو تعظیم کرو
 سب نے کہا کس کی تعظیم کریں۔ یہاں تو کون بھی نہیں ہے وہ بولا نواب صاحب
 تشریف لاتے ہیں۔ اور یہ کہہ کر ایک پانڈی سلنے رکھی اور ڈھکن اٹھایا تو وہاں
 میں سے ایک بڑا سا میڈ کی اُچھل کر بیچ محفل میں ٹپک گیا۔

اب اسمانے پھر نکل پچا تا شروع کر دیا ارے میاں اٹھو اٹھو جلدی
 اٹھو ساتھیوں نے پھر حیران ہو کر پوچھا۔ آخر کس کیلئے اٹھیں اسمانے کہا ہے
 وہ تو! تم نے پہچانا نہیں! اور میڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا آپ ہیں
 گڑھیہ والے نواب صاحب۔

حاضر جوابی

بھاضر جوابی خدا کی ایک دیبا ہے جو ہر کس و نا کس کو نصیب نہیں، ہوتا۔ حاضر جوابی سے یہ غرض نہیں کہ جواب سنا کر لوگوں کے دانت دکھائی دینے لگیں، تاہم لازم یہی ہے کہ حریف کیلئے وہ دندان شکن ہو، مگر ایسا ہوا جو حریفوں کے دانت کھٹے کر دے اور دوسروں کے دانت بھی دکھائی دینے لگیں وہ ظرافت کا بہترین نمونہ ہے۔

عندِ داستان میں گفتگو کی نوک چھوکی عام طور پر صلیح، جگت اور پھبتی میں رہتی ہے اور زیادہ تر ان صفتوں کے ذریعہ ہی بات چیت میں مزاج پیدا کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ضالغ، لفظی اور دوسری صفتیں بھی ہیں جو کمالِ تعلیق بالکلیہ صنفِ سخن اور ادب لطیف سے ہے۔

آج سے کوئی نصف صدی پہلے ان ہی صفتوں نے عوام کی بول چال کو بہت دلچسپ بنا رکھا تھا اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی گفتگو میں بھی شاعرہ اور اربابِ تراشکیتیں پیدا ہو گئی تھیں اور یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں کی باتوں کو اکثر صاحبانِ علم اور اربابِ ذوق سن کر ششدر رہ جاتے تھے۔

واقعہ دیکھا جاوے تو اُلٹی سیدھی باتوں کے ذریعہ مذاق پیدا کرنا،

”کوہ کنڈ کاہ برآوردن“ سے زیادہ حیات نہیں رکھتا اور ہر دہیوں کی،

شکل بنا کر اپنے مخاطب کو ہنسانا گرے ہوئے مذاق سے زیادہ دلچسپ نہیں رکھتا اسی لئے زمانہ دراز سے مغفک، کنہر، ظرافت اور بزلہ سنجی کا ہنر

خاص، خاص مخلوقوں سے منسوب رہا ہے۔ اور اس میدان میں وہی لوگ، طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ خوش طبعی، طرافت، بذلہ گوئی اور حاضر جوابی ایک ایسی دولت ہے جو ہر انبیان کو نصیب نہیں ہوتی۔

لطیفوں کی قسمیں: لطیفہ گوئی کا سب سے بڑا عنصر، اسلوب بیان ہے یعنی خوش طبع اصحاب کا خیال ہے کہ ایسے لطیفے جن میں خاص طور پر مقررہ اصولوں کے تحت گفتگو میں مزاح پیدا کیا گیا ہے یا خوش مذاق اور اہل ذوق، حضرات کے برجستہ ناپے تھے ہوئے جوابات بذات خود ایک لطیفہ ہیں مگر ان اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے تو صرف چار قسم کے لطیفے رہ جاتے ہیں۔

جمع سے عوام، دماغی تفریح اور روحانی غذا حاصل کرتے رہتے ہیں۔

پہلی قسم کے لطیفے: پہلی قسم کے لطیفے وہ ہیں جنہیں خوش فکر حاضر دماغی اور خوش طبع حضرات اپنے دماغ سے ڈھال ڈھال کر پیش کرتے رہتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشاء، ثواب سعادت علی خاں کے دربار جاتے وقت لوگوں سے پوچھتے تھے کوئی نقل، کوئی چٹکلا یا ہے؟ لوگ کہتے تھے،

آپ کے آگے، اور ہم لطیفہ کہیں؟ کہتے کہ ارے میاں کوئی بھی اُٹھی، یہ بھی بات یہی یاد ہو کہ ڈالو پھر ہم اس میں نون، مربع لگا کر چٹ پٹی کر لیں گے۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ انشاء اللہ خاں انشاء، ثواب سعادت علی خاں کے دربار پہنچے، اتفاق سے وزیڈنٹ بہادر کے میرمنشی، علی نقی خاں بیٹے ہوئے باتیں کر رہے تھے، انشاء گفتگو میں کسی کی زبان سے حضرت سعدی کا یہ مصرعہ نکلا۔ وہ شاید کہ پلنگ خفتمہ باشد، میرمنشی صاحب نے ثواب سے مخاطب ہو کر کہا میرے خیال میں دو گلستان، کہ ہر شعر میں مختلف روایتیں ہیں ممکن ہے۔ حضرت سعدی کا یہ مصرعہ اس طرح سے ہو: شاید کہ پلنگ خفتمہ باشد، ثواب سعادت علی خاں نے انشاء اللہ خاں کی طرف دیکھا۔ انشاء اللہ خاں نے عرض

کی کہ حضور میرنشی صاحب بجا فرماتے ہیں۔ غلام نے بھی ایک نسخہ میں لکھا دیکھو کہ

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد عیب و ہنرش نہ ہفتہ باشد

ہر بیشہ میر کہ خالصت شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

انشاء نے کہا کہ وہ نسخہ بہت صحیح اور خوش تھا، اس میں دو گتے اور ہفتہ

اور ہفتہ کے معنی بھی مکھے ہوئے تھے، پھر نشی سے مخاطب ہو کر کہا کہ یکے میر

نشی صاحب وہ کہنی، تو آپ کو یاد ہوں گے، یہ سن کر نشی صاحب تو سکتہ میں

آگے، لیکن نواب صاحب پھر کی گئے اور انشاء کو گلے سے لگا گیا اور بار بار

وہی اشعار پڑھتے جاتے تھے اور انشاء کی پیشانی کو چومتے جاتے رات کو صرف

اسی قدر تھا مگر انشاء ایک محفل میں جب یہ واقعہ بیان کیا تو اہل محفل ہنستے

ہنستے لوٹ گئے۔ سنئے، انشاء اللہ خاں فرماتے ہیں۔

میاں! شعر پڑھنا تھا کہ یہ معلوم ہوا کہ کسی شیر نے آکر مجھے دبوچ

لیا، کوئی سواگز کا سینہ جو پکڑ کر بھینپا تو را دھر ہڈیاں پلپلی ہو گئیں اور اُدھر

دم گھٹنے لگا۔ مذا خدا کر کے گرفت ڈھیلی ہوئی اور میرا ذرا اعلیٰ ہوا، ابھی سانس

بھی نہ لینے پایا تھا کہ نواب صاحب نے میرے گلے میں باہیں ڈالی، بوسہ پر بوسہ لینا شروع

کر دیا، بھلا مجھے دیکھو اور نواب صاحب کی اس حرکت کو دیکھو بوسہ بازی تو کچھ افغانانہ

ہی میں جلی معلوم ہوتی ہوگی۔ مجھے تو مارے شرم کے پنیے چھوٹ گئے مگر اللہ کا

بندہ دم بھی نہیں لینے دیتا تھا ذرا دم لیا اور سبحان اللہ کہہ کر پھر لیٹ جاتا، لیٹا اور

لیٹتے ہی بوسہ پر بوسہ لینا شروع کر دیتا بے چارے دوسرے بھلے آدمی کی کہتے ہوئے

نا بھالا نا ایسے درباروں کو میرا دور ہی سے سلام ہے کون بے چارہ شعر،

پڑھ کر بوسہ پر بوسہ دے اور محفل میں اپنی ہڈیاں بھی تڑوا لے۔

غرض کہ معمولی سی بات کو گھٹا بڑھا کر دلچسپ بنا دینا بد معیہ گو، بد لہ

سنج یا قادر الکلام مقرر کیلئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے موقع اور محل کی مناسبت

سے ذہ جہاں چاہتا ہے بات کا بے سنگ بنا دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اسکا بات کو فٹھر کر کے دو لفظوں میں ادا کر جاتا ہے۔

اکثر بذلہ سنج اور خوش طبع حضرات، لطیفہ گوئی کو خوش مذاقی اور، ظرافت کے ابدال کڑی سمجھتے ہیں، اسلئے مختلف عنوانات پر انھیں بیولہ لینے، چٹکلے اور پہلیاں یاد رہتی ہیں۔ ہمیشہ ان کا نوک زبان پر آبدار، اشعار اور پھڑکتے ہوئے جملے کھیلنے رہتے ہیں۔ اور ہر موقع پر ایک کی کڑی دوسرے سے ملا کر ایک نیا لطیفہ پیدا کر لیتے ہیں۔

لطیفہ گوئی کا سب سے بڑی خول یہ ہے کہ کسی معمولی واقعہ کو کم سے کم الفاظ میں اس خول سے ادا کر دیا جائے کہ سننے والے پھرک اٹھیں۔ پہلی قسم کے لطیفوں کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

ایک روز انشاء اللہ خاں، نواب صاحب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے ان کا سر منڈا ہوا دیکھ کر نواب صاحب کی طبیعت کھرا آئی، ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول جاکر رسید کی، انشاء اللہ خاں نے جلدی سے ٹوپی، سر پر رکھ لی، اور کہا سبحان اللہ، بچپن میں بزرگ سمجھایا کرتے تھے وہ بات سچ ہے کہ نیلے سر کھانا کھاتے ہیں تو شیطان دھول مارتا ہے۔

خواجہ میر درد کے ہاں کسی جلسے میں شاہ عالم بغیر اطلاع تشریف لے آئے اتفاقاً اس روز شاہ عالم کے پاؤں میں درد تھا اسلئے ذرا پاؤں پھیلا دیا، خواجہ میر درد نے کہا یہ امر فقیر کے آدابِ محفل کے خلاف ہے! شاہ عالم نے کہا معاف کیجئے عارضہ سے مغدور ہوں، فرمایا کہ جب عارضہ تھا تو تکلیف کرنے کا کیا ضرورت تھی۔؟

ایک روز مولوی شاہ عبدالغریز صاحب دہلوی خواجہ میر درد کے

ہاں چلے گئے۔ محرم کا چہنہ تھا مرثیہ خوانی پوری تھی، گویے اور زبڈیاں محفل میں موجود تھیں، شاہ صاحب اس وقت جوان تھے یہ رنگ محفل دیکھ کر مسکرا دیئے خواجہ صاحب اعتراض کو پا گئے اور ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے فقیر کے نزدیک تو یہ سب مان، ہمن ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ پھر مان بہنوں کو عوام الناس میں، لیکر بیٹھنا کیا مناسب ہے؟

ایک روز مرزا غالب اپنی بہن کی عیادت کو گئے، پوچھا کیا حال ہے؟ بولیں مرنے والی ہوں، قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لے جاتی ہوں۔ مرزا نے کہا، بوا! کھلا یہ کیا فکر ہے اللہ میاں کے ہاں کیا مفتی صدر الدین چلے جاتے ہیں، جو ڈگری کر کے پکڑوا بلائیں گے۔

کسی محفل میں امام بخش صہبائی کا ذکر آیا، غالب نے کہا کہ مولانا نے بھی کیا عجیب و غریب تخلص رکھا ہے، عمر بھر ایک چلو پینی نصیب نہیں ہوئی اور صہبائی کہلاتے ہیں۔ سبحان اللہ، قربان جائے اس القاد کے اور مدتے جائے اس تخلص کے!

ناطق مکرانی نے غالب کے اس مصرع پر اعتراض کیا، "خوک شود پنجم زدن ساز کرد" اعتراض یہ تھا کہ خوک یعنی سور کو پنجم نہیں ہوتا، ہر زمانے کا آپ کی بندہ لہازی اور اصلاح کا میں ممنون ہوں، میں اس کو بدلادوں گا، مگر میں ف کیسے میں نے کبھی سوروں کا بیو پار نہیں کیا ہے اس لیے مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔

ایک مرتبہ غالب نے مشاعرہ میں اپنی فارسی غزل پڑھی جس وقت یہ مصرع پڑھا، "یوادی کہ در آن خضر را عیا خفت است" مولوی امام بخش صہبائی

کی تحریک سے مفتی صدر الدین صاحب نے فرمایا کہ "عصا خفت است" میں کلام ہے
مرزا صاحب نے کہا کہ میں ہندی تشراد ہوں اس لئے آپ نے میرا عصا پکڑ لیا، اس
بشرازی کا نہ پکڑا گیا سر

و لے بہ جملہ اول عملے شیخ نجف

مرزا کے خسر نواب الہی بخش خاں محرونی نے مرزا کو ایک شجرہ نقل
کرنے کیلئے دیا آپ نے یہ حرکت کی کہ ایک کا نام لکھا اور ایک حذف کر دیا، پھر
ایک نام لکھا اور ایک حذف کر دیا اور اس طرح پورا شجرہ ختم کر کے حوالے کر دیا۔
انہوں نے دیکھ کر کہا کہ تم نے غضب کیا ہے۔ یہ شجرہ تو غلط ہو گیا۔ مرزا نے کہا کہ
حضرت شجرہ تو دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے، "ذریعہ سے ایک میٹر تھا
درمیان سے نکال دی جائے تو کوئی حرج نہیں ہوتا" اچک کر دوسری میٹر بھی پر
چڑھ سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ غالب محفل میں میر تقی میر کی تعریف کر رہے تھے، ذوق نے
سودا کو میٹر پر ترجیح دی، غالب نے کہا کہ میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا مگر آج
معلوم ہوا کہ آپ "سودا" ہیں۔

ایک روز شاہ عالم بادشاہ نے مرزا رفیع سودا سے فرمایا کہ بھی مرزا
کتنی غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟ جواب دیا کہ "پیر و مرشد جب طبیعت لگا جاتا ہے
تو دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔ حضور نے فرمایا "بھی ہم تو پانچا نہ میں بیٹھے، بیٹھے
چار چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ سودا نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور! اس
میں دیسی ہی بو آتی ہوگی۔"

ایک ہنسی گو شاعر نے ایک دن کہا کہ میں نے رات کو خواب میں دیکھا کہ حضرت
 خضر علیہ السلام نے اپنا نقاب دھوا "میرے منہ میں ٹپکا دیا ہے۔ سوچا کہ کیا
 تم غلط سمجھتے ہو تو تمہارے منہ پر تھوکتا چاہتے تھے۔ اتفاق سے تمہارا منہ
 کھلا ہوا تھا، تھوکی اسی میں جا پڑا۔ !

ایک فضول گو شاعر جج کر کے داپس آئے۔ سودا سے ملے، اپنا دیوان
 دکھایا اور کہا کہ برکت کی غرض سے میں نے اس دیوان کو "حجر اسود" سے خوب رگڑا
 ہے سودا نے کہا کہ بہتر ہوتا کہ آپ اس دیوان کو آب زمزم سے بھی دھو لیتے۔

مولانا شبلی کے دوستوں میں ایک شاعر ریحان تخلص کرتے تھے۔ شاعر صاحب
 کے ہاں لڑکا تولد ہوا۔ بچہ کارنگ ذرا سانولا تھا۔ انھوں نے مولانا سے لڑکے کا نام
 رکھنے کی فرمائش کی۔ مولانا نے فرمایا بھی اسی کا نام اپنے تخلص کی رعایت سے
 "تخم ریحان" رکھ دو۔ !

دوسری قسم کے لطیفہ وہ

لطیفوں کی دوسری قسم
 ہیں جو مقبول اور زبان
 خاص و عام لطیفوں کے توڑ پر یکے جلتے ہیں یا کسی لطیفے میں سے کچھ تغیر اور
 تبدیل کر کے اپنے مزاج، ذاق یا ملکی رسم و رواج کے مطابق ڈھال بیتم یا یا
 یعنی ایسے گزرے ہوئے واقعات کو بے کم و کاست الفاظ میں اس طرح
 بیان کر دیا جاتا ہے جس طرح کہ وہ واقع ہوئے ہیں بلکہ بعض اوقات ای الفاظ
 بھی دہرا دیئے جاتے ہیں جو اسی شخص کی زبان سے نکلے ہیں۔ ہاں پس منظر
 پیدا کرنے کے لئے ذرا گرد و پیش کو ملے رنگ کی ضرورت پڑتا ہے تاکہ واقعات
 کے کارٹون الگ اُبھرے ہوئے دکھائی دینے لگیں۔

اس قسم کے اکثر لطیفے لیسے ہوتے ہیں نہ تو پڑھنے والے کو پڑھنے میں دقت ہوتی ہے اور نہ سننے والے کو فہم پر پہنچنے کیلئے گفتگو انتہا رکھنا پڑتا ہے۔ ادھر دو جملے ختم ہوئے۔ ادھر منہ سے دانت نکلی پڑتے ہیں اور چہرے پر تبسم کی ہر دھڑ جالتی ہے اس طرز کے کچھ لطیفے سنا حفظ فرمائیے۔

عبداللہ دودھاری میں چہرہ سی نے باہر آ کر آواز لگائی کہ "ملنا نیام و نیکنار میا" وغیرہ حاضر ہیں۔ ایک چہار بج پکار رہے ہیں اندر داخل ہوئے، مجسٹریٹ نے پوچھا کیا تم و نیکنار میا ہو۔؟ کہا کہ حضور میں و نیکنار میا نہیں، وغیرہ ۵۵!

ایک امیدوار پارلیمنٹ نے انتخابی جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں کو "ایجوکیشنل ریفرم"، "سوشل ریفرم"، "اکنامیکل ریفرم" اور اس قسم کے بہت سے ریفرم کا ضرورت ہے ایک صاحب نے مجمع میں سے زور سے کہا کہ جناب اب آپ کو بھی کلوز ریفرم کی سخت ضرورت ہے۔

ایک صاحب کو مرضِ تیفن اور پیٹ کی بیماریوں کا عارضہ تھا وہ دکتوں میں بیٹھے ہوئے شلرنج کھیل رہے تھے جب دو تین سخت مائیں کھائیں تو جنھیں کربلا اٹھے کہ آپ کیا اور آپ کا باط کیا میاں اِمات دینے کیلئے پیٹ میں مارہ چاہیئے دیکر صاحب نے جواب دیا کہ مادہ بھی اسیا کہ جلاب پر جلاب دیکے جائیں اور پیٹ میں اشتربک نہ ہونے پائے۔

وکالت کے امتحان میں سوال تھا کہ شہادت کسے کہتے ہیں؟ ایک صاحب نے لکھا کہ راہِ حق میں اپنی جان کے اتیار کرنے کو شہادت کہتے ہیں اور پھر تفصیل سے کر بلا کا راقمہ لکھ ڈالا۔!

ایک کنجوس نے فقیر سے کہا کہ بھیک مانگنا اچھی بات نہیں ہے! فقیر نے جواب دیا حضور! میں نے بھیک مانگی ہے آپ سے صلاح نہیں مانگی ہے ایک گرہ کٹ عین موقع پر گزرتا ہوا۔ مقدمہ کے دوران اس کے دلیل

نے مجسٹریٹ سے کہا حضور میرے موکل نے بہت ہی معمولی چوری کی ہے وہ موکل کی بٹے۔
مجرم نے دیکھی سے بگڑ کر کہا، کیا یہ چوری کوئی معمولی چوری ہے بھلا کوئی کر کے تو دکھائے؟
ایک شخص نے ایک انسپکٹر پولیس کو بندر کہا، وہ اس کی جواب دہی کیلئے عدالت طلب
کیا گیا۔ مجسٹریٹ: تم نے ایک انسپکٹر پولیس کیلئے لیا ہے ہودہ لفظ کیوں استعمال کیا؟
ملازم: تو کیا حضور اس لفظ سے تو ہیں یا اپنا سنتا حضور ہوئی۔
مجسٹریٹ: بے شک سخت انسپکٹر ہوئی۔

ملازم: سرکار اگر انسپکٹر پولیس کو بندر کہنا جائز نہیں تو بندر کو انسپکٹر پولیس کہنے میں تو کوئی توہین نہیں
مجسٹریٹ: میرے نزدیک تم بندر کو جو چاہو کہو!
ملازم: ملازم نے یہ سن کر مجسٹریٹ کا شکریہ ادا کیا پھر انسپکٹر پولیس کی طرف دیکھ کر کہا
کہیے ”انسپکٹر پولیس صاحب آپ کا منزل کیا ہے؟“

مجسٹریٹ: متعجب کا بیان ہے کہ جیہاں اُسے دیکھتے ہو تو گالیاں دیتے
ہو۔ اس کے متعلق تمہارا کیا جواب ہے؟

ملازم: حضور اس کا جواب دو یہ عدالت ہے۔ بازار ہوتا تو میں اس
لاپوری طرح جواب دیتا۔

مجسٹریٹ: تو کیا تم تسلیم کرتے ہو کہ مقتول کے سر پر کلہاڑی ماری تھی
ملازم: میں نے صرف دھمکانے کا غرض سے کلہاڑی ماری تھی۔ کوئی
حفاظت خواستہ مار ڈالنے کا نیت تھوڑی تھی۔

ایک گواہ سریم ٹی شدہ پیش ہوا۔ مجسٹریٹ نے پوچھا کہ واقعہ کے
وقت تم کہاں تھے۔

گواہ: سرکار میں واقعہ کے اثناء تھا۔

محشریٹ - جب تم نے رقم مانگی تو مدعی علیہ نے کیا کہا؟
مدعی - اس نے کہا کہ جہنم میں جاؤ۔

محشریٹ - پھر تم نے کیا کہا؟

مدعی - پھر میں عدالت میں حاضر ہو گیا۔

دکیل محشریٹ سے مخاطب ہو کر - براٹھے کرم اس بچے کو چھوڑ دیجئے یہ
بچہ ابھی نا سمجھ ہے اور اسی طرح حرامز دگیاں کرتا ہے جیسے اپنے بچپن کے زمانہ میں
ہم اور آپ کیا کرتے تھے۔

محشریٹ - ملزم سے مخاطب ہو کر کہا تم جانتے ہو کہ سرکار کی طرف سے کوئی
دکیل تمہارے لئے مقرر کیا جائے۔

ملزم - حضور دکیل کی ضرورت نہیں ہاں دو ایک گواہ میری طرف سے تیار
کر کے اگر حضور نے آئیں تو بڑی غایت ہوگی!

دکیل گواہ سے - اچھا ملزم نے تمہارے ہنہ پر تھپڑ مارا اس کے بعد
کیا ہوا۔

گواہ - اس کے بعد ملزم نے پھر مجھے تیسرا تھپڑ مارا۔
دکیل - دوسرا تھپڑ کہو۔

گواہ - جی نہیں دوسرا تھپڑ تو میں نے ملزم کو مارا تھا۔

دکیل - ہاں تو اب یہ سچ سچ کہہ دو کہ تم نے چوری کی تھی یا نہیں۔

حوکل - ضرور کی تھی چوری نہ کا ہوتا تو پھر آپ کی نہیں کیوں کر ادا کرتا ہے؟

ایک دکیل ایک گواہ پر جرح کر رہا تھا۔ گواہ نے غصہ میں کہا کہ میں جتنا رسید کر دوں گا۔ وکیل نے میٹریٹ سے شکایت کہ میٹریٹ نے کہا کہ تم ذرا ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔

ایک طریقہ کا صحبت میں ایک میٹریٹ صاحب بیٹھے ہوئے طنز یہ اپنے کارنامہ بیان کر رہے تھے کہ میں فلاں لیڈر کو جس دوام کی سزا دی۔ فلاں قاید کو سولی پر چڑھانے کا فیصلہ دیدیا اور فلاں باغی شاعر کو جلا وطن کر دیا طریقہ ان بد مزہ باتوں سے اکتا گیا اور کہنے لگا۔ کہ جناب کیا بہتر ہوتا کہ اس باغی شاعر کے ساتھ آپ مجھ کو بھی جلا وطن کرا دیتے!

ایک دکیل گواہ پر جرح کر رہے تھے پوچھنے لگے کہ کیا تم پہلے بھی شہادت دیتے آئے تھے۔

گواہ۔ جی نہیں!
دکیل۔ تمہاری صورت کچھ بالی پہچانی سی معلوم ہوتی ہے!
گواہ۔ جناب میری شراب کی دکان ہے۔ کبھی آپ وہاں تشریف لائے ہوں گے۔

میٹریٹ نے گواہ سے مخاطب ہو کر کہا تمہارے بھائی کا شہادت قلبند کا جا چکی ہے۔ دیکھو جی! تم نے جھوٹ بیان کیا تھا کہ تمہاری ایک ہی بیوی ہے اب تمہارا بھائی یہ کہتا ہے کہ اس کا دو بیویاں ہیں ٹھیک ٹھیک تباؤ کہ تمہاری کتنی بیویاں ہیں درنہ دروغ حلفی کا مقدمہ تم پر چلایا جائے گا۔

نچ۔ تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ مرغیاں تمہاری ہیں؟

مدعی۔ سرکار اس نسل کی مرغیاں میرے گھر کے سوا اور کہیں نہیں ہے۔
 نج۔ یہ تو کون بات نہیں میرے گھر میں بھی اسی نسل کی مرغیاں موجود ہیں۔
 مدعی۔ حضور پہلے بھی چند ماہ پیشتر میری کچھ مرغیاں چوری ہو گئی تھیں۔

ایک دوست۔ کچھ اس مقدمہ کا کیا ہوا، جو تم نے اس آدمی پر چلایا تھا جس کے کتے نے تم کو کاٹا تھا۔ کیا پرچہ ملا ہے۔
 دوسرا دوست: پرچہ کیا؟ الٹا پرچہ مجھ کو دینا پڑا اس کے دکیل نے یہ ثابت کر دیا کہ کتے نے مجھ کو نہیں کاٹا بلکہ میں نے کتے کو کاٹا تھا۔

ایک مقرر، عورتوں کی صلاحیتوں اور ان کے حقوق پر تقریر کر رہا تھا۔ اٹھائے تقریر میں اس نے کہا کہ عورتیں مثل مردوں کے ہاتھ پاؤں رکھتی ہیں آنکھ رکھتی ہیں، دل و دماغ رکھتی ہیں۔ اور ان کے صرف بدن کا سافٹ میں، مردوں کے ساخت سے بہت تھوڑا فرق ہے۔ جمع میں سے ایک صاحب چیخ کر بولے کہ ”بہت تھوڑا فرق زندہ باد“

ایک نیا شادی شدہ جوڑا سینما دیکھ رہا تھا۔ ایک عشقم سیمین میں بیٹھ کر اور بیسویں دلوں ایک دوسرے کو بیخ بیخ کر پیار کر رہے تھے۔ بیوی نے شوہر کو کہنی مار کر کہا کہ تم اس طرح کیوں نہیں پیار کرتے۔؟ شوہر نے کہا تمہیں معلوم بھی ہے اس بیسویں دلوں کی طرح پیار کرنے کا کتنا معادضہ ملتا ہے؟

ایک نوجوان لڑکا اپنے دوست سے کہنے لگا کہ افسوس میری ہینوں کی اکارت گئی، ابھی محبت کی بات شروع کی تھی۔ لیکن پوری نہ ہو سکی دوست نے کہا کیا

لڑکی کے باپ تم دونوں کے بیچ میں آگئے۔ جواب دیا کہ نہیں بیچ میں نہیں آئے بلکہ پیچھے سے آگئے۔ !

ایک شخص۔ بھالٹا تم نے میرا جان بھال لیا ہے۔ میں کیوں کرتا تھا اصلاً تاروں۔ ؟
دوسرا شخص۔ بس میری بیویہ ساس سے شادی کر لو اور اُن کو دور کسی ببردنی ملک لے کر چلے جاؤ۔

شوہر (لڑائی کے دوران) بس میں سمجھتا ہوں کہ اب تم اپنی ماں کے پاس جانے کی دھمکی دو گی۔
بیوی۔ میں ایسی بیوقوف نہیں ہوں میں تو اپنی ماں کو بچھنے بلا نے والی ہوں۔

ایک خواتین کی کانفرنس میں ایک نہایت بدشکل عورت تقریر کرنے کھڑی ہوئی۔ تقریر کا عنوان تھا ”چربان اور سکون“ اُس نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مثلاً میرے شوہر کو ہی لیجئے۔ وہ بہت سخت مزاج اور نہایت تنگ دل ہیں مگر میں اُن سے بد مزاجی سے پیش نہیں آتی جب وہ رات دیر گئے نشہ میں چور گھر آتے ہیں تو کیا میں ان سے بدسلوکی کرتی ہوں ہرگز نہیں! گایاں دیتی ہوں؟ ہرگز نہیں پھر آپ پوچھیں گی میں کیا کرتی ہوں میں تو ان کے گلے میں بائیں ڈال کر پیار کر لیتی ہوں۔
جلسہ سے کسی نے چلا کر کہا کہ ”بس اُس کم بخت کی یہی سزا ہے۔“

مبہنیوں کے ایک ایجنٹ نے کسی نیا کٹری پہنچ کر اس کے پردہ پر ایڑ سے کہا کہ مشر میرے پاس ایک ٹٹ مشین ہے جو بولتی ہے، جواب دیجیئے،

خطوط کھولتی ہے اور جبین بھی صاف کرتی ہے۔
 پیر و پرائیٹر نے جواب دیا کہ مجھے اب اس قسم کی مشینیں کی ضرورت
 نہیں اس لیے کہ کل ہی میری شادی ہو چکی ہے۔

ایک سیمہ کمپنی کا ایجنٹ کسی کروڑ پتی کے پاس پہنچا اور کہا کہ آپ اپنی
 جان کا سیمہ کرا لیجئے۔ کروڑ پتی نے کہا کہ میری ایک آنکھ شیشے کی ہے اور ایک اصلی
 اگر یہ تباہ ہو کہ اس میں کوئی شیشے کی ہے تو میں تم سے سیمہ کرا لوں گا۔ ایجنٹ نے ہاں میں
 آنکھ کی طرف اشارہ کیا۔ کروڑ پتی نے کہا کہ صحیح ہے۔ مگر یہ تو تباہ کہ تم نے
 یہ کیوں کر پہچانا۔ جواب دیا کہ اس آنکھ میں بہ نسبت دوسری کے انسانیت زیادہ ہے۔

ایکٹر (نلم ڈائریکٹر سے) ڈنر کے سین میں آپ کو سچے سچے کھانا پکھیتا دینا
 ہو گا۔

نلم ڈائریکٹر۔ بہت اچھا مگر موت کے سین میں آپ کو سچے سچے مرنے ہو گا۔

پیر و پرائیٹر (نئے ملازم سے) کہا منبر صاحب نے یہی سمجھا دیا ہے کہ
 تمہیں کیا کام کرنا چاہیئے۔
 ملازم۔ جی ہاں انھوں نے تاکید کر دی ہے کہ جب میں دور سے آپ کو آتا ہوں
 دیکھوں تو ان کو جگا دوں!

ڈاکٹر۔ ایک خاتون مرلیفہ سے تمہیں کوئی خاص شکایت نہیں صرف آرام کرنے
 کی ضرورت ہے۔

مرلیفہ۔ لیکن ڈاکٹر صاحب میرا زبان تو دیکھئے۔

۷۴
ڈاکٹر۔ ہاں اس کو بھی بہت آرام کی ضرورت ہے

باپ نے بیٹے سے پوچھا کہ تمہارے نئے ڈاکٹر صاحب کیا پوچھ رہے تھے؟
بیٹے نے جواب دیا کہ پوچھتے تھے کہ کیا تمہاری بستی میں صرف ایک ہی قبرستان ہے؟

ایک طرف ڈاکٹر نے مریض کی توند پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ جناب آپ کے پیٹ
میں کیا کیا بھرا ہوا ہے۔ توند مریض نے کہا کہ کیا ہے؟ فضلہ ہے
ڈاکٹر نے کہا کہ میں یہ دریافت کر رہا ہوں کہ اس میں آپ کا ہی فضلہ ہے
یا تمام شہر کا

ڈاکٹر نے دونوں ہاتھوں سے مریض کے پیٹ کو اچھی طرح دبا دبا کر دیکھا
اور پوچھا کہ تمہارے پیٹ میں درد تو نہیں ہوتا؟
مریض نے کہا کہ بہت سخت!
ڈاکٹر نے پوچھا کہ کب سے
مریض نے جواب دیا کہ جیسا کہ آپ دبا رہے ہیں۔

ایک سرجن (بادس سرخون سے) اچھا یہ بتاؤ کہ یہ مریض علی جراحی کے قابل
ہے یا نہیں؟

سب بادس سرخون نے مریض کو اچھی طرح دیکھ کر کہا کہ اس کو علی جراحی
کا کون سا ضرورت نہیں۔

سرجن تم سب کے سب غلطی پر ہو میں اس پر علی جراحی کر دے گا؟
مریض جو علی جراحی سے ڈرتا تھا نہیں سرجن صاحب آپ علی جراحی نہیں

کر سکتے۔ بارہ ڈاکڑوں کے مقابل میں آپ کہ ایک رائے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔
لایئے میرے کپڑے عنایت فرمائیے اب میں جاتا ہوں۔

ایک ماسٹر صاحب کا نئے تھے۔ ایک روز کہنے لگے کہ میں اسکول کے طالب علموں
سے یکساں برتاؤ کرتا ہوں۔ چاہے وہ امیر ہو یا غریب، ہندو یا مسلمان، سکھ
ہو یا عیسائی!

ایک شوخ لڑکا بولا کہ واقعی آپ سب کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتے ہیں!

استاد (لڑکوں) سے تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ اگر ہم اچھے کام کریں تو
کہاں جائیں گے؟ لڑکے چپ چاپ بیٹھے رہے۔

استاد۔ اچھا میں بتاتا ہوں۔ وہاں سونے کی خوبصورت عمارتیں ہیں ہرے
بھرے درخت ہیں رنگ برنگی پھول کھلے ہوئے ہیں اور دلکش باج بجلے۔
سب لڑکے ہنسنے آواز پاں سمجھ گئے!

استاد بھلا بتاؤ تو!

سب لڑکے سننا سننا۔!

ایک معلم اپنے کلاس میں غرور اور انکساری کا فرق استعارے کی صورت
میں گلاب اور نیفشتہ کی مثال دے کر اس طرح سمجھا رہی تھی۔ بول، لڑکھو، دیکھو۔

ایک حسین صورت زرق برق لباس پہنے باغ میں ہمارے سامنے ہے اس قدر مغرور ہے کہ
اپنے سوا کسی کو نہیں دیکھتی اور کسی سے مخاطب تک نہیں ہوتی تم جانتی ہو وہ کون ہے؟

وہ گلاب ہے اب اس کے پیچھے ایک نہایت حقیر چیز ہے وہ غرور انکساری سے
اپنا سر اٹھکھٹکے ہوئے اسے بتاؤ وہ کون ہے؟ ایک لڑکی۔ وہ اس کا شوہر ہے؟

ایک صاحب دند ان ساز کا دوکان لگے، دند ان ساز نے کہا ذرا ہنہ کھولے ریغ
نے اپنے آنکھیں بند کر کے ہنہ چاڑ دیا۔
دند ان ساز نے کہا ہر بان اس قدر ہنہ نہ چاڑیے میں تو باہر کھڑا رہ کر
دانت نکالتا ہوں۔

دو خواتین ایک ریل کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھی سفر کر رہی تھیں اور
ان کے آپس میں کھڑکی کھولنے اور بند کرنے پر سخت جنگ ہو رہی تھی۔
ایک کہہ رہی تھی کہ اگر کھڑکی بند رہی تو میں گھٹ کے مر جاؤں گی!
دوسری کہتی تھی کہ اگر کھڑکی کھلی رہی تو میں جاڑے سے سکڑ کر مر جاؤں گی۔
گارڈ پریشان تھکا کہ کیا کیا جاوے؟ ایک مسافر جو اسی درجہ میں بیٹھا تھا۔
ٹھنڈی سانس لے کر بولا گارڈ صاحب! اول کھڑکی بند کر دو تاکہ ہر ایک
دم گھٹ کر مر جائے اور پھر کھڑکی کھول دو تاکہ ہر دو کا سردی سے فائدہ ہو جائے
اور ہماری جان اس عذاب سے بچوٹے۔!

ایک بیوی نے اپنے مرحوم شوہر کا روح کو محاضرات کے ذریعہ طلب کیا
اور پوچھا کہ پیارے تم وہاں کیا آرام سے ہو؟ روح نے جواب دیا کہ بہت آرام
سے ہوں۔ بیوی نے پھر پوچھا کہ اس دنیا میں جہنم اور تم ملا کر رہتے تھے
کیا وہاں اس سے بھی زیادہ آرام ہے۔

روح نے جواب دیا کہ ہاں، دنیا کا نسبت جہنم میں تمہارے ساتھ
زنگ لبر کرتا تھا اب مجھے بہت آرام ہے۔ بیوی نے پھر سوال کیا کہ بھلا یہ تو
تباہی کہ اب جہنم میں کیا آرام ہے؟
روح نے جواب دیا جہنم کیسی؟ کہاں کا آرام جس وقت سے تم نے

میری روح کو حاضر اتر کے ذریعہ طلب کیا ہے میں خبت میں نہیں ہوں بلکہ تمہاری قربت سے میں دُوزخ کی بدترین اذیت میں مبتلا ہوں۔

ایک صاحب کچھ سوچ میں بیٹھے ہوئے تھے پیچھے سے دوسرے صاحب نے اُن سے شانے پر بہت زور سے ایک ہاتھ مارا اور کہا کہ کہو راج کیا سوچ رہے ہو۔؟ اس نے مڑ کر جو دیکھا تو یہ پریشان ہو کر کہنے لگے کہ جناب معاف کرنا میں اپنے دوست راج کے دھوکے میں آپ سے یہ حرکت کر بیٹھا۔ اس نے کہا خیر وہ تو مضائقہ نہیں مگر آپ نے اپنے دوست راج کو اتنے زور سے کیوں مارا؟ اس نے کہا جناب وہ میرا دوست ہے میں جتنے زور سے چاہوں ماروں، آپ کو ان معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔!

ایک امیر تاجر کی ٹانگ خرد ہو کر سوکھ کر شل ہو گئی اس نے ڈاکٹر کو بلا کر مشورہ کیا۔ مگر اتفاق سے یہ ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹروں سے زیادہ راست باز اور سچا تھا۔ تاجر سے کہا کہ اب آپ اس کا علاج دغزہ کچھ نہ کیجئے یہ عارضہ صرف عمر کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ تاجر نے جواب دیا کہ اگر یہ عمر کی وجہ سے ہے تو میری دونوں ٹانگیں ہم عمر ہیں ایک ہی ٹانگ کیوں شل ہوئی دوسری ٹانگ کو بھی شل ہو جانا چاہیے تھا۔

ایک معمولی استعداد کا ڈاکٹر مجمع میں بیٹھا ہوا غیر معمولی طور پر بلند آواز سے باتیں کر رہا تھا ایک صاحب اس کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوئے اور ڈاکٹر کے جانے کے بعد دوسرے صاحب سے کہنے لگے کہ اب بھی آپ کو اس شخص کی علمیت میں کلام ہے اُس نے جواب دیا کہ مجھے اس کی علمیت کا اثر علم نہیں

۷۷
مگر یہ علم ضرور ہے کہ عام اس قدر شور و غل نہیں مچاتا ہے۔

ایک کنس لڑکی نرسنگ ہوم میں ٹریننگ کیلئے داخل ہوئی ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ میرا کیس سرجیکل ہے یا میڈیکل ڈاکٹر نے ہنس کر جواب دیا کہ کیا تم کو ان دونوں کا فرق معلوم ہے؟ لڑکی نے جواب دیا کہ ہاں! سرجیکل کیس وہ ہے جس میں تم اچھے جاؤ اور بیمار نکلو اور میڈیکل کیس وہ ہے کہ تم بیمار جاؤ اور اچھے نکلو۔

ایک شخص نے کسی طرف سے پوچھا کہ علی الصباح مرغ بانگ دیتے وقت ایک ٹانگ زمین پر ٹیک کر دوسری ٹانگ کیوں اٹھا رکھتا ہے۔
اس نے جواب دیا کہ اگر وہ دونوں ٹانگیں اٹھائے تو وہ زمین پر گر پڑے گا۔

کسی نے ایک شاعر سے کسی کنجوس کے متعلق دریافت کیا کہ دسترخوان پر اس کے ساتھ کون کھانا کھاتا ہے۔

شاعر نے جواب دیا کہ مکھییاں!

ایک متمہی۔ بچوں کا امتحان لے رہے تھے، ایک بچے سے پوچھا دو دولہ؟
بچے نے کہا چار۔

متمہی صاحب نے کہا شاہاش اور مٹھالی کی چار گولیاں نکالا اس کو

انعام میں دیں۔ دوسرے سے پوچھا دو چوک؟

دوسرے بچے نے کہا آٹھ۔ اس کو آٹھ گولیاں دی گئیں۔

تیسرے بچے سے پوچھا درتے۔؟

تیسرے بچے نے کہا سہتر

متعین صاحب اس کو لال پیلے ہو کر گھورنے لگے۔

بچے نے کہا جناب سوچیے گا بدھ میٹھی میری سہتر گولیاں سیدھے ہاتھ سے گین کر رکھ دیجیے۔

استاد۔ انسان کے ہاتھ پاؤں میں کیا نسبت ہے؟

طالب علم۔ صرف یہ کہ ہاتھ ہنہ تک اور پاؤں زمین تک پہنچ جائیں!

ماسٹر۔ اچھا بتاؤ کہ شکر کہاں سے آتی ہے؟

طالب علم۔ بننے کی دوکان سے!

استاد۔ (جو طالب علموں کو ہوم ورک دے چکا تھا) کیا تمہیں کوئی

سوال پریشان تو نہیں کرتا؟

شاگرد۔ جی نہیں، سوال تو صاف ہی صرف جواب ہی پریشان کرتے ہیں

معلمہ ایک دن وہ آگے گا کہ زمین فنا ہو جائے گی۔

ایک لڑکی۔ پھر جو لوگ ہوائی جہاز میں اڑ رہے ہوں گے وہ کہاں اتریں گے۔

استاد۔ اشیمن کسے کہتے ہیں۔

شاگرد۔ پانی کی روانگی کی کہتے ہیں۔

ماسٹر۔ شبنم کا تعریف کرو۔

شاگرد۔ زمین جی اپنے محور پر گھومتے گھومتے تھک جاتا ہے تو اس کے پیٹ
نکل آتا ہے۔

استاد۔ اچھا تباؤ کم مصور تصویریں کھینچے اپنا نام کیوں لکھ دیتے ہیں؟
بیم۔ اسی لئے کہ الٹی سیدھی معلوم ہو سکے!

کلاس میں آرٹ اور حسن کاری پر بکچر ہو رہا تھا۔ استاد نے کہا کہ بڑے
فخر کا بات ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے نامور آرٹسٹ بھی تھے جن کے ہاتھوں میں
یہ قوت تھی کہ ایک ہی گردش میں پنتا ہوا چہرہ روتا ہوا بنا دیتے تھے۔
ایک شاگرد۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میری ماں بھی ہاتھ کا ایک
ہی گردش میں میرے باپ کا چہرہ الیا ہی بنا سکتی ہے۔!

استاد۔ پچھلے قلعہ مینا رکھا تھا۔
شاگرد۔ وہ قلعہ قلعہ شاہ کی بیویاں رشتی تھیں۔

اگر سونے کو کھٹلی ہوئی ہوا میں رکھا جائے تو کیا نتیجہ ہوگا؟
طالب علم۔ چوری!

استاد۔ عجباتم بنا سکتی ہو کہ وہ کون سا جانور ہے جس کے نہیں دانت
نہیں ہوتے۔ لڑکا۔ جی ہاں۔
استاد۔ تباؤ تو؟
لڑکا۔ ہمارے مانی جان۔!

استاد - دیکھو وہ دیوار پر ہندوستان کا نقشہ لٹکا رہا ہے
 جہاں تباؤ اس میں پانی کہاں ہے۔
 شاگرد نے نقشہ کی سطح پر ہاتھ پھیر کر کہا یہاں پانی ولای کہیں نہیں
 ہے نقشہ بالکل خشک ہے۔

ایڈیٹر - تمہارے چہرے، بشرے سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے
 اچھے دن دیکھے ہیں، پھر اس حالت میں کس طرح اپونچے۔ کیا تمہارا کوئی دوست
 نہیں ہے۔؟
 شریف سائل - جی نہیں میرا ایک بھی دوست نہیں، میں مدتوں اس
 اخبار کا ایڈیٹر رہا ہوں۔

ایڈیٹر اور رپورٹر (اگر تمہیں ایسے مسائل اور معاملات پر کچھ
 لکھنا ہے جس کے متعلق تم کچھ نہیں جانتے تو کس طرح لکھو گے؟
 رپورٹر - میں اپنا رپورٹ اس طرح سے شروع کروں گا.....
 ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ
 ایڈیٹر: بالکل ٹھیک، اچھا ختم کس طرح کر دے؟
 رپورٹر - بس یہاں کہ اس معاملہ پر صفحہ کے صفحہ تکے جاسکتے تھے
 مگر افسوس کہ یہاں گنجائش نہیں ہے۔
 ایڈیٹر بہت خوب، بہت خوب آج سے تم ہمارے چیف رپورٹر ہو۔

ایک دفعہ بریس رپورٹر، حجام کی دکان پر بال کٹوانے کیلئے گئے۔ دیکھا کہ ایک
 نوجوان حجامت بنوا رہا ہے اور اس کے سر پر بہت گھنے بال ہیں۔ پوچھا کہ کیا تم مجھ

۸۱
سے بھی وہی اُجرت لوگے۔ یہ تو بڑی ناانصافی ہے؟

نانی نے جواب دیا کہ حضور آپ سے بھی وہی اُجرت لی جائے گی اس وجہ سے کہ میرا اُتنا ہی وقت صرف ہوگا یعنی آدھا وقت بالکل ٹخنے میں اور آدھا وقت آپ کے بال ڈھونڈنے میں۔ !

ایک شخص چھت پر سے ایک خوش مذاق شخص کے سر پر گہرا اور اُن کی گردن ٹوٹ گئی گھبرا کر ان کی مرہم پٹی کاٹ لی۔ کوئی صاحب عیادت کو آٹے اور واقعہ دریافت کیا مسکرا کر کہا ہماری قسمت بھی بڑی عجیب ہے کہ ایک صاحب چسل کر چھت سے گرے اور گردن ہماری ٹوٹی !

ایک دوست نے دوسرے سے کہا کہ یار تمہاری بیوی تو بہت پتہ قد ہے؟
جواب دیا کہ قیامت اور مہبت جس قدر کم ہو اچھی ہے !

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا کہ میرا ملازم کام کرتے وقت ہمیشہ ٹی بجاتا ہے۔ جواب دیا کہ تم تو بڑے خوش قسمت ہو ہمارا نوکر تو ہمیشہ ٹی بجاتا رہتا ہے۔ !

علم دیکھتے دیکھتے ایک عرب نے بڑی لمبی جمالی ل۔ ایک انگریز نے طنزاً کہا کہ کیا آپ مجھے لگنا چاہتے ہیں۔؟ عرب نے جواب دیا کہ آپ گھبرا ئے نہیں ہمارے ہاں سور کھانا حرام ہے۔

آقا نوکر نے تو یہ سمجھتا ہے کہ میں بے وقوف ہوں؟

نوکر۔ حضور میں کچھ کہہ سکتا اس لیے کہ میں آج ہی آیا ہوں۔

ایک استاد نے پوچھا کہ وہ کون سا مسئلہ ہے جس پر تمام دکیل اور ڈاکٹر متفق ہیں۔

ایک لڑکے نے جواب دیا کہ نہیں۔ !

ایک جگہ گدھے کھڑے تھے۔ شوہر نے مذاقاً اپنی بیوی سے کہا کہ وہ دیکھو تمہارے رشتہ دار کھڑے ہیں۔ بیوی نے کہا کہ ہاں میرا تو ان سے سسرال کا رشتہ ہے !

مالک نے نوکر سے کہا تو ہر وقت سوتار بتا ہے نوکر نے جواب دیا کہ آپ ہی نے خود کہا تھا کہ تجھے یہاں سونا پڑے گا۔ !

تیسری قسم کے لطیفے

متمدن ممالک میں اس فن کے بیسیوں ماہرین موجود ہیں جو ہزاروں لطیفے گھر بیٹھے ہوئے گھڑتے رہتے ہیں۔ اور ہفتے ہفتے ہزاروں روپیہ پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے لطیفوں میں بعض تو ایسے بے ساختہ لطیفے ہوتے ہیں کہ سبحان اللہ اور بعض میں تعجب اور بناوٹ ہوتی ہے اور اکثر لطیفوں میں سن گھڑت قیسے، بالکل اچھوتے سنے اور معنی خیز اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ مقصد ضرور پوشیدہ رہتا ہے۔

لیکن ان میں بہت سے ایسے لطیفے بھی ہیں جن میں زبردستی کچھ تان کر، مذاق پیدا کیا جاتا ہے اور صرف کسی ایک مزاحیم لفظ کا خاطر بہت بیا رنگوں سے کام لیا جاتا ہے۔

اس قسم کے لطیفوں کی مثالیں حسبِ ذیل ہیں۔

ایک امیر کا خاصہ، دسترخوان پر چُنا ہوا تھا۔ ایک قاب میں مرغِ مسلم، دوسری میں ایرانی پلاؤ ایک میں بادام کا میٹھا، دوسری میں سویوں کا مرغِ غیر تھا۔ امیر کھانا کھانے کیلئے بیٹھا ہی تھا کہ کولہ ضروری کام آ پڑا۔ جہاں فوراً جانا ضروری تھا اُٹھ کھڑا ہوا اور ملازم سے چلتے چلتے کہا کہ۔

دیکھو! کسی کو دسترخوان پر نہ آنے دینا اور نہ تم کسی چیز کو ہاتھ لگانا، اس قاب میں مرغِ بند ہے کہیں تمہاری غفلت نہ اڑ نہ جاوے اور دوسری قاب میں نہ ہر پلاؤ ہلا ہے۔

ملازم تھا شہنشاہ، ادھر امیر نے گھر سے قدم نکالا اُدھر اُس نے اول تو مرغِ مسلم چٹ کر ڈالا اور پھر بادام کا میٹھا خوش جان کر دیا اس کے بعد تھوڑا سا پلاؤ کھایا اور باقی صحن میں بکیر دیا اور خود دیوڑھی پر جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں امیر واپس آئے تو دیکھا کہ دسترخوان صاف ہے۔ غصہ میں آکر بولے کہ بے وقوف تو نے یہ کیا کیا۔؟

ملازم نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ کہ حضور خطا معاف، سرکار کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ مرغِ قاب سے نکلی کر اُڑا۔ میں ڈرا کہ اب کیا ہوگا؟ مگر وہ نہ آیا، آخر سرکار کے خوف سے میں نہ ہر پلاؤ ہلا کر پیالہ بنا لیا اور اب ملک الموت کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ حضور تشریف لے آئے۔

ایک داعی نے اشتعال دے دیا کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں کہ جن کی سپید داڑھیاں ہیں اور دوسرے وہ کہ جن کی کالا داڑھیاں ہیں مگر قیامت میں ہر دونوں سپید داڑھی والے سیاہ داڑھی والوں کے طفیل میں جنتے جائیں گے۔

ایک طرف... یہ سن کر آہستہ سے اٹھے اور اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہتے کہ مولانا مگر اس گھنگار کی داڑھی تو بالکل لالہ ہے پھر آپ کے حساب سے یہ عامی کس شمار و قطار میں ٹھہرے گا۔

ایک راجہ کے عہد میں کینوں کا عروج ہوا، یہاں تک کہ نیلی، لدانی ساربان اور ایک ملاجی یہ چاروں وزارت کے درجہ تک پہنچ گئے اتفاق سے غنیم نے حملہ کیا۔ راجہ نے چاروں وزیروں کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ تیلی بولا، ابھی کیا دیکھا ہے۔ تیل دیکھے تیل کی دھار دیکھے۔

لدان بولا۔ تانت باجے، راگ بوجھے، ساربان نے کہا اب دیکھے وقت کا اونٹ کس کرٹ بیٹھتا ہے۔ ابھی یہ مشورہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اطلاع ملی غنیم نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ ملا صاحب نے سن کر راجہ سے کہا کہ ہرج کیا ہے۔ آپ کا ملک گیا۔ غنیم کا ایمان گیا اللہ اللہ خیر سلا

ایک راجہ صاحب اپنی جاگیر میں روز ایک نئے تعلقہ دار کا تقرر کرتے تھے اور فوراً اس کا ہر طرف کا پر وائز بھی جاری کر دیتے تھے۔ اتفاقاً اس عہدہ پر کسی طرف کا تقرر ہو گیا طرف گھوڑے کا دم کا طرف ہنہ کر کے بیٹھا اور اس ہیبت کذا لہ سے اپنے مستقر کی جانب روانہ ہوا۔

راجہ نے دیکھ کر کہا کہ تم کو گھوڑے پر بیٹھنا تک نہیں آتا۔؟ جواب دیا کہ سب کچھ آتا ہے مگر اس لیے اس طرح بیٹھا ہوں کہ اگر

آپ میرے پیچھے ہر طرف کا پر وائز روانہ کریں تو قبل از قبل دیکھ لوں اور میری دالپی آسان رہے۔!

ایک روز ایک شیخ، میٹرک کے کورس میں مولانا حالی کی نظم حب الوطن

بڑھا رہے تھے جب اس معرکہ پر پہنچے کہ۔
 ”بھاگ اس ملک کے جس ملک میں راجہ اس کا۔ تو بھاگ کے نفع پران کے
 قدم اکھڑے مگر سنبھلی کر فرمانے لگے دیکھو، بھاگ اس ملک کے“ اس میں کے
 غلط چھپ گیا ہے۔ سب طلباء ”بھاگ اس ملک کے“ کا جگہ ”بھاگ اس ملک سے“
 بنا لیں اب مطلب صاف ہو گیا۔ !

ایک طرف کسی درویش کا جہان تھا اس کا مکان بوسیدہ تھا، اور چھت
 کی لکڑیوں سے چٹ، چٹ کی آدازیں آرہی تھیں، طرف گھرا یا کہ قبلہ یہ کیا ہو رہا
 ہے۔ درویش نے کہا خون ناکرد میرے گھر کڑیاں، ذکر و تسبیح کرتی ہیں، طرف
 نے کہا مجھے ڈر اس بات کا ہے کہ کہیں اسی ذکر و اذکار میں کہیں انیس عالم
 جذب پیدا ہو جائے اور یہ رقص کر کے سجدے میں نہ آ پڑیں، اور اس وقت
 میرا کیا حشر ہوگا۔

ایک روز نواب صاحب نے اپنے طبیب سے کہا کہ اب پرہیز کرتے
 کرتے ہی بیمار ہو گیا ہے بیٹھا کھانے کو طبیعت بہت چاہتا ہے طبیب نے
 آکر نبض دیکھی تو کہا کہ آپ نے کوئی سخت بد پرہیز کیا ہے۔ کہا کہ میں نے آپ کے
 غرضانے کے مطابق صرف آدھا لڈو کھایا ہے۔ اور وہ آدھا لڈو دیکھا ہی،
 سامنے رکھا ہوا ہے۔ طبیب نے پلٹ کر دیکھا کہ آدھا لڈو تقریباً (۱/۲) سیروزی
 رکھا ہوا ہے کہا کہ جناب آٹا بڑا لڈو بنایا کہ جس کا آدھا چار سیر کے قریب ہے۔
 اٹھلنے کا کہ میں ہمیشہ اسکا ذن کا لڈو کھاتا ہوں۔ !

بھالکے قحط کے وقت ایک راشی آفیسر نے مرغی خانوں کے منجرب کو طلب

کر کے پوچھا کہ تم اپنی مرغیوں کو کیا کھلاتے ہو؟ ایک منجھر نے جواب دیا کہ غلہ۔
 راشن آفسر نے اُسے گرفتار کر لیا۔ اور کہا کہ غلہ تو ہم بھوکے عوام کیلئے جمع کر رہے
 ہیں اور تم مرغیوں کو کھلا رہے ہو۔؟ تمہارے خلاف سخت کارروائی کی جائیگی۔
 پھر دوسرے منجھر سے پوچھا کہ تم اپنی مرغیوں کو کیا کھلاتے ہو؟ اس نے سوچ
 کر جواب دیا کہ بھوسہ۔ راشن آفسر نے اُسے بھی گرفتار کر لیا اور کہا کہ بھوسہ
 سے ہم ننگے عوام کیلئے کپڑا تیار کر رہے ہیں۔ اور تم مرغیوں کو بھوسہ کھلا رہے ہو۔
 تم پر بھی مقدمہ چلایا جائے گا۔

اس کے بعد اس نے تیسرے منجھر کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ تم اپنی مرغیوں
 کو کیا کھلا رہے ہو۔! اس نے جواب دیا کہ حضور! میں تو اپنی مرغیوں کو روزانہ
 پیسے تقسیم کر دیتا ہوں اور اُن سے کچھ دیتا ہوں کہ بازار جاؤ اور اپنی غذا آپ
 خرید کر کھا لو۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک بڑھا آدمی منہ پر ہاتھ بھر کر دارٹھی لے
 کسی محفل میں انگریز نو جوان کی طرح مٹھار مٹھار کر باتیں کر رہا تھا ایک بزرگ
 نے اس سے پوچھا کہ حضرت ذرا یہ تو بتائے کہ آپ عمر میں بڑے ہیں یا آپ
 کی دارٹھی۔؟

بوڑھے آدمی نے جواب دیا کہ جناب پچھلے میں پیدا ہوا ہوں اور بعد میں
 میری دارٹھی پیدا ہوئی ہے۔ اس حساب سے میری عمر دارٹھی سے بہت زیادہ ہے۔
 بزرگ نے کہا آپ کی دارٹھی نے تو اپنا رنگ بدل دیا مگر انسوں آپ نے اپنا رنگ
 نہیں بدلا۔

ایک ظریف کپڑے والے کا دوکان پر کھڑے تھے۔ وہیں ایک طوائف بھی،

تشریف لائیں جن کا نام اٹھیا سکا تھا۔ ظریف نے ایک تھان اٹھا کر دوکان دار سے پوچھا کہ اس کے کیا دام ہیں۔؟ جواب دیا کہ نوے روپے۔ ظریف نے کہا کہ میں تمہیں اٹھیا سکا دیتا ہوں راضی ہے۔؟ اس نے کہا کہ جی نہیں میں کوڑی کم نہیں لوں گا۔ ظریف نے کہا کہ میں آپ دونوں کے درمیان تعینہ کر دیتی ہوں یہ نوے کہتے ہیں اور آپ اٹھیا سکا نہ آپ کی بات اور نہ ان کی بات، ظریف صاحب آپ نو اسی دیتے تو یہ راضی ہو جاتے ہیں۔

ایک صاحب قبرستان گئے تو قبر پر کتبہ دیکھا، جس پر لکھا ہوا تھا کہ میں اس شخص کا فرزند ہوں جس کے قبضہ میں ہوا تھی جب وہ چاہتا اس کو زندہ کر لیتا اور جب چاہتا اس کو مہا کر دیتا تھا۔

اس کتبہ کو دیکھنے کے بعد انھیں یہ خیال ہوا کہ شاید کسی بزرگ کا لڑکا ہے یا کسی جادوگر کا اولاد ہے۔ جب وہ مڑے تو دیکھا کہ اس کے سامنے ایک اور بھی قبر تھی جس کے تختہ پر کندہ تھا "میرے بالکل متبادل میں جو قبر ہے" ایک شہنی باز اور پرے درجہ کے چھوٹے آدمی کی قبر ہے اس کا باپ ایک معمولی لوہار تھا اور صوفی کتبہ، دھونکے وقت بھتم میں ہوا بند ہو جاتی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد نکل جاتی تھی۔!

ایک گویا کسی کنجوس امیر کے سامنے دیر تک گاتا رہا۔ گانا ختم کرنے کے بعد انعام اکرام مانگا امیر نے کئی دفعہ اپنی داڑی پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ تمہیں کچھ نہیں مل سکتا اس نے کہا کہ کیوں؟ جواب دیا کہ ہمارا دستور ہے کہ ہم جب کسی کو کچھ روپیہ پیسہ دیتے ہیں تو پہلے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور جتنے بال ہماری انگلیوں میں آتے ہیں اس کو آٹنا ہی انعام دیتے ہیں۔! آج تیرے نام پر ہم نے دو تین مرتبہ ہاتھ پھیرا لیکن تو آٹنا بد قسمت ہے کہ ایک بال بھی نہ ٹوٹا اس واسطے تجھ کو ہم کچھ پیسے دے سکتے۔!

گویا یہ بات سن کر کہنے لگا کہ حضور! یہ شرط تو ٹھیک نہیں، اسی لئے کہ،
حضور کا ہاتھ تھا اور حضور کی داڑھی تھی۔ انھوں نے تو یہ حکم داڑھی حضور
کا اور ہاتھ ہو میرا، پھر اگر بال نہ اُکھڑے تو بے شک غلام کا قسمت ہے۔

ایک دفعہ رات کے وقت کسی قاضی صاحب کے گھر کے سامنے دو آدمی لڑ
رہے تھے قاضی صاحب نے اپنی بیوی سے کہا کہ ذرا قندیل تولاد رکھوں یہ لڑائی کیوں
ہو رہی ہے؟ بیوی نے کہا کہ جا کر کیا کر دوں گے۔ لیکن وہ نہ مانے چادر اڑھا اور قندیل
لے کر باہر نکلے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ قاضی صاحب کو دیکھ کر ان میں سے
ایک آدمی اُن کی طرف بھاگا اور اُن کی چادر اُتار کر بھاگا۔ تھوڑی دیر کے بعد
دوسرا آدمی اُس کے پیچھے بھاگا۔ قاضی صاحب چادر کھو کر اندر آئے بیوی نے
پوچھا پتہ چلا کہ وہ آدمی کیوں لڑ رہے تھے! قاضی صاحب نے کہا کہ وہ دو آدمی،
میری چادر کیلئے لڑ رہے تھے۔

ایک تانے پر ڈاکو نے حملہ کیا اور لوٹ مار کرنے لگے، ایک ڈروک
آدمی جان بچا کر بھاگا۔ اور ایک گدھے کے پیٹ کے نیچے جا چھپا۔ لیٹرولانے
دیکھ لیا اور پکڑ لائے۔ پوچھا یہ کیا حرکت تھی، کہا کہ خدا کے واسطے مجھے چھوڑ
دو میں تو اس گدھے کا بچہ ہوں۔ لیٹرولانے ہنس کر کہا کہ بیوقوف یہ تو نہ رہے
اس کا بچہ کیسے ہو سکتا ہے؟

جواب دیا حضور! مان مر گئی ہے اور باپ کے حوالے کر گئی ہے!
چوتھی قسم کے لطیفے

چوتھی قسم کے وہ لطیفے ہیں۔ جن میں مختلف لوگوں کے خصوصیات، معاشقہ
زندگی کا خاکا اور عادات، دالوں کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی ہے اس قسم

کے واقعات، روزمرہ ہماری نظروں سے گزرتے رہتے ہیں اور ان مفہم کہ خیر، حرکتوں اور کمزور پہلوؤں کی تصویریں اس خوبی سے الفاظ میں کفایت دیتی ہیں کہ لوگ سن کر بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں مثلاً

ایک تارک صاحب کو تمباکو میں شیرہ ڈالنے کا مزدورت بھی ایک دکاندار کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ”آپ کے پاس بشارت ہے شروع ہو“ اور عین کو صبح مخرج کہ ساتھ ادا کیا۔ دکاندار نے کہا کہ جناب شیرہ تو ہے مگر اتنا گاڑھا نہیں ہے قضا آپ کے حلق سے نکل رہا ہے۔

ایک عرب بیٹی اپنی اور چند اردو الفاظ سیکھ لے کر کسی چور نے اس کا سامان چرائیا۔ وہ بے چارہ صبح مسافر خانہ میں پہنچ رہا تھا کہ اسیا انسان شور، (لوگو چور) بہت لوگ جمع ہو گئے اور اشاروں میں واقعہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ چوری ہو گئی۔ پھر پوچھا کیا چیز چوری ہو گئی تو عرب نے کہا کہ ”داہ بیتی“ داہ بکری یعنی ایک بیٹی اور ایک بکری۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بعض سیاح جو ایک ملک سے دوسرے ملک ایک ریاست سے دوسری ریاست میں جاتے ہیں اور وہاں کی زبان کی لا علمی اور، رسم و رواج سے ناواقفیت کا وجہ سے بہت سی ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو نہایت مفہم خیر ہوتی ہیں۔ چند روز ہوئے میں نے ایک سیاح کا سفر نامہ پڑھا تھا۔ جس میں بیسوں دیدہ زیب منہ و ستانی مناظر تھے اور اس نے حتیٰ الامکان ہر مقام کا حال اپنے خیال میں نہایت صحت اور وضاحت سے لکھا تھا مگر اس کا ہر واقعہ ایک لا جواب لطیفہ تھا بد قسمتی سے وہ دعویٰ محرم کو لکھنے

ہونے، دیکھا کہ لوگ تفریضے کا ندھوں پر دھرے ہوئے ہوئے حسن، حسین کی آوازیں لگاتے ہوئے کر بلا کی جانب چلے جا رہے ہیں۔ اس واقعہ کو آپ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ قمر کے دسویں تاریخ کو میں لکھنؤ پہنچا اس روز قیامت کا دن تھا یعنی ہر ایک ہندوستان اپنے کا ندھوں پر اپنی اپنی قبریئے ہوئے، قیامت کے میدان کی طرف چلا جا رہا تھا اور ہر ایک شخص باب سن، جناب سن، صاحب سن، جناب سن (حسن حسین) کے دلخیز نعرے لگا رہا تھا۔

ایک ہندوستان مسافر پکین و چین کے دارالسلطنت میں سیر کرنے گیا۔ ایک ہوٹل پہنچا زبان سے نا واقف تھا اس لیے اشاروں سے کچھ کھانے کا چیزیا مانگیں ان میں سے ایک ڈش اسے بہت پسند آئی جب بٹلر آیا تو اس نے یہ دریافت کرنا چاہا کہ کیا یہ بطخ ہے؟

اس کے واسطے اس نے بٹلر کے سمجھانے کو لفظ "قان، قان، قان" کہا بٹلر نے ہاتھ کے اشارہ سے کہا نہیں اور اس نے آواز نکال "میو میو" (یعنی بلی ہے)

ایک میم صاحب کے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور دودھ پلانے کے واسطے ایک گدھی کی ضرورت ہوئی۔ اپنے میرے کو بلا کر کہا ویلی بیرا بابا کے واسطے ایک گدھا لاؤ۔ بیرا بیچارہ ایک کھیار سے جا کر خاصا ٹھنڈا گدھا خریدا لایا۔ اب میم صاحب دیکھتی ہیں تو اس میں ٹھنڈی نہیں گھرا کر میرے سے بولیں کہ ویلی بیرا یہ صاحب کے ما پھل ہے، ہمارے ما پھل لاؤ (یعنی ستر نہیں مادہ)

ایک روز ایک صاحب بہادر کی دعوت ایک نواب صاحب کے ہاں تھی بلاؤ آیا تو صاحب بہادر نے لینے سے انکار کیا۔ نواب صاحب نے کہیں یہ ہندوستان

۹۱
کی خاص ڈش ہے صاحب بہادر جن کو اردو دال کا بہت دعویٰ تھا کہنے لگے کہ
معاف! ہم صرف اپنی بان پہچان دالوں کو کھاتا ہے۔

ایک پارسی کرکٹ کھیلنے میں مشہور تھا اس کو اردو زبان دال کا بھی
دعویٰ تھا کسی نے پوچھا کہ بیٹی جو آپ سے بہتر بھی کوئی کرکٹ کھیلنا جانتا ہے
انھوں نے نہایت کثر نفسی سے جواب دیا کہ وہاں کا تو چھوٹا چھوٹا کھیل دال
ہمارا باپ ہے۔

ہندوستان کے کسی شہر میں ایک بنگالی بابو نے ایک بھشتی کو دیکھا
کہ کمر پر بھری ہوئی مشک لیے سپاہی کو پانی پلا رہا ہے چونکہ بنگال میں بھشتی نہیں
ہوتے اس لیے وہ ان دونوں کی حرکتوں کو غور سے لکھتا رہا۔ کسی نے پوچھا
کہ بابو جی کیا دیکھ رہے ہو تو بابو جی نے فرمایا کہ شپاٹ شالا تو شپالی شالا مگر
یہ چاڈی تھیلی والا کا۔

ایک بنگالی بابو دہلی پہنچے بھٹیاریہ سندھ دریا سے روٹیاں نکال کر ایک
طرن رکھتا جاتا تھا۔ چونکہ بنگال میں سندھ دریا نہیں ہوتے اس لیے وہ اس تماشے
کو حیرت سے دیکھتا رہا۔ کسی نے پوچھا کہ بابو جی کیا دیکھ رہے ہو تو جواب دیا
کہ اللہ کی کڑت دیا کھو اور مانس کا بدھی دیا کھو، شالا بیٹا کنوئیں میں سے
روٹی نکالتا جا رہا ہے۔

کسی سیٹھ نے دعوت کا اس میں انگریزوں کو بھی مدعو کیا جب لوگ
جانے لگے تو سیٹھ صاحب ہر ایک کو ایک بھول سو گھنی پاتھ میں اور ایک گبر

گلے میں ڈال دیتے تھے ایک گجرا میم صاحب کو بھی دیا میم صاحب نے اُسے ہاتھ میں لٹکا لیا۔ سیٹھ صاحب نے کہا کہ میم شاپ اس بار کو اپنے کنبھ میں ڈال لیں تو بہت اچھا لگے گا۔

ایک شخص کی گاٹے چوری گئی اس کا مقدمہ عدالت میں ایک انگریز

محتریت صاحب کے اجلاس پر پیش ہوا۔

محتریت۔ ویل! ہم نہیں سمجھا کہ گاٹے کس کو بولتا ہے۔؟ ہم گاٹے دیکھنا مانگتے ہیں۔ دکیل صاحب نے محتریت کے حکم کے مطابق گاٹے کو عدالت میں پیش کیا۔ صاحب بہادر کا نظر گاٹے پر پڑی تو فوراً چس کر کہنے لگے۔ ویل! ایڈوکیٹ۔! یہ تو جیل کا میم صاحب ہے یہ ہم کو معلوم تھا تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا!

ایک مدراسی محتریت اپنی بیوی کو عدالت میں تماشہ دکھانے کیلئے لائے اور جہرمیں چلمن کے پیچھے بیٹھا کہ خود اجلاس پر رونق افروز ہو گئے، دکل، ملزمین اور کوڈٹ انسپکٹ وغیرہ سب اپنے اپنے مقام پر کھڑے ہو گئے۔ پھر تمام اہلکاران عدالت کو ایک لائن میں کھڑا کر کے اپنی بیوی کے جانب مخاطب ہوئے اور کہا۔ اویے یہ طزمان۔ طزمان لکے تو گناہ کرے سوانوں۔

یہ کوڈٹ انسپکٹ یا کوڈٹ انسپکٹ کیے تو گناہ کرے سوان کو سزا دلانے والا یہ دکیلاں۔ دکیلاں کیے تو ہمارے مدراسی سٹا میں ہیں نا، پلیڈر میں وہ یہ صنم داران صنم داران کیے تو میرے ہاتھ کے نیچے کام کرتی سو کلر کال اور یہ سب کے اُپر میں ہرا۔

ایک صاحب مدراسی سیر کرنے گئے، راستہ میں ایک شخص نے کسی

مقام کا تہہ دریاقت کیا اُس شخص نے نہایت غصہ میں آکر جواب دیا آپے
کون خفت! راستہ میں میرے کو پکڑنے کو پوچھیں سو میں پوسٹ میں کیا
تھنا تہہ تہانے کو۔!

ایک بٹھان سفر کر رہا تھا ان کے ساتھ ریل میں ایک مرہ بھی تھا
ایک اسٹیشن آیا۔

خان صاحب نے پوچھا کہ یہ کون اسٹیشن ہے؟ مرہ نے کہا کہ کٹے سانگت؟
خان صاحب نے فوراً اپنی ڈائری نکالی کٹے سانگت نوٹ کر لیا۔ دوسرا اسٹیشن آیا
خان صاحب نے پھر پوچھا یہ کون اسٹیشن؟ مرہ نے پھر وہی کہا کہ کٹے سانگت؟
خان صاحب نے پھر ڈائری نکال کر کٹے سانگت خورد نوٹ کر لیا۔
تیسرے اسٹیشن پہ خان صاحب نے پھر پوچھا کہ یہ کون اسٹیشن؟ مرہ نے پھر
وہی کہا کہ کٹے سانگت؟ بس خان صاحب کو غصہ آ گیا، دبا کے ایک گھونٹہ
رسید کیا اور کہا ہر اسٹیشن کا نام کٹے سانگت بتاتا ہے۔ مرہ گھبرا کر چنیا کہ،
کٹے زالم، کٹے زالم؟

اس پر خان صاحب ٹھنڈے ہوئے اور کہا کہ گھونٹا کھا کر صبح نام
بتایا اور جھٹ اپنی ڈائری میں اس مقام کا نام کٹے زالم لکھ لیا۔
اردو کے محاورے

ہم اقسام کے لطیفوں کے علاوہ اردو زبان میں کئی محاورے اور
ہزب الہا مثالیں ایسی ہیں۔ جن کا وجہ تسلیم نہایت ظریفانہ انداز میں بیان
کے لگائے۔ چنانچہ ان محاوروں کو واقعات کے ساتھ یا کہو کہ واقعات
کو محاوروں کے ساتھ ایسا چکا دیا گیا ہے کہ جیسے گوند سے کاغذ مگر ایسی،
تحریریں انگریزوں کے ہاں ہوتیں تو انہیں ادبیات میں ایک خاص رتبہ حاصل

ہوتا۔ اس کے علاوہ جن ذیلہ پنج اور خوش مذاق حضرات نے وہ محاورے بتائے
ہیں۔ ان کے نام سنہری حرفوں میں تفصیل کے ساتھ ہر لطیفہ، محاورے
اور ضرب الامثال کے ہمراہ لکھے جاتے۔

دو چار محاورے اور ان سے منسوب واقعات آپ بھی ملاحظہ فرمائے
”وہ یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے“

ایک نابینا شخص کو کسی نے دعوت دی۔ نابینا نے کہا کہ دعوت
میں کیا، کیا کھلاؤ گے۔ اس نے جواب دیا کہ کھیر۔ نابینا نے تعجب سے
پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے؟ جواب دیا کہ سببہ بگلا جیسی۔ نابینا نے پوچھا
کہ بگلا کیسا ہوتا ہے۔ اس نے مذاقاً اپنے ہاتھ کو ٹیڑھا کر کے بگلے کی چرنج کی
طرح بنایا اور کہا کہ دیکھو بگلا ایسا ہوتا ہے۔

نابینا نے اس کے مڑے ہوئے ہاتھ اور کان کو اچھی طرح سے ٹٹول
کر کہا کہ ٹیڑھی یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے۔؟

”یہیں بیٹھے۔ بیٹھے بیٹگی ملی بتا رہے۔“

ایک صاحب نے اپنے نوکر سے کہا کہ باہر دیکھ کر آ کہ بارش ہو رہی ہے
یا نہیں تو کمرے میں سے پیچھے موڑے جواب دیا کہ سرکار ابھی تو مہینہ برس رہا ہے
مالک نے کہا کہ تجھے کیسے معلوم ہوا اس نے جواب دیا کہ سرکار ابھی ~~بہر~~ سے
ملی آئی تھی میں نے اس کا پیٹا سہلا لیا تو دیکھا کہ وہ بیٹگی ہوئی تھی مالک نے
طیش میں آ کر کہا کہ بے وقوف چل باہر جا کر دیکھ، یہیں سے پیچھے بیٹگی
ملی بتا رہے۔

”غنت ر بود“

ایک صاحب گلستان پڑھ رہے تھے جب اس معرغہ پر پہنچے کہ،

سعدی کہ گوئے بلاغت ربود۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ حضرت بلا تو خیر بلا ہے
مگر یہ غت ربود کے کیا معنی ہیں۔؟

”رحمت ہر نباشِ اول“

ایک کفن جو قبر میں کھود کر مردے باہر نکالتا اور ان کا کفن بے
کراں کا طرح بے گور کفن باہر پھینک کر چلا آتا تھا تا مام مردے اس کا اس
حرکت سے عاری تھا مگر مردہ بدست زغہ کیا کر سکتے تھے۔ چند روز بعد وہ مر گیا
لوگ سن کر بہت خوش ہوئے تھوڑے روز بعد کسی دوسرے شخص نے وہ قبرستان
سنبھال لیا یہ حضرت ان سے بھی دو ہاتھ بڑھ کے نکلے یعنی قبر کھود کر مردہ
نکالتے اور کفن آمار کر اس کے پاؤں میں سی بانڈھ کر درختوں سے اٹاٹا لٹا کر
چلے آتے تھے لوگوں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو ایک زبان ہو کر کہا کہ ”رحمت
ہر نباشِ اول“

”خوب شد کہ بیل نہ بود“

ایک مرتبہ شہر کرسی کے لوگوں نے مشورہ کیا کہ بادشاہ کو کچھ نہ کچھ
تحفہ دینا چاہیے ایک نے کہا کہ یہاں کے بیل اچھے ہوتے ہیں وہی نذر دیئے
جائیں تو مناسب ہے دوسرے نے کہا کہ کیت تحفہ روانہ کیئے جائیں تو بہتر ہے
مگر ایک بحر بہ کا بڈھنے نے کہا کہ بیل یا کیت نے کر کیا بادشاہ اپنے سرے
مارے گا۔ اگر خدا نخواستہ کھٹے نکلے تو بد مزگ اور بد نامی کا اندیشہ ہے
اوسے میاں گولر دو گولر اس راے پر سب نے ہداٹے آفرینا بلند کی۔
ہزاروں گولر توڑے گئے اور ہر ایک گولر کو اچھی طرح سے چکھ کر بڑے
بڑے جھوں میں جایا۔ اور تقریباً تین سو چار سو جھو بے لیکر بڑی،

شان و شوکت سے یہ مجمع لکھنؤ روانہ ہوا۔ تین چار روز بعد دربار میں پہنچے
تھوڑے بار شاہ کے ملا نظم میں پیش ہوئے۔

”اندھیر نگری جو پٹ راجہ ٹکے میر بھائی ٹکے میر کھایا“
ایک گرو اور چیلے ہم سفر تھے ایک مقام پر پہنچے، گرو نے چیلے سے
کہا کہ رسولؐ بنانے کے لیے کچھ بازار سے خرید لے۔ چیلے گئے تو بہت سامان
خرید لائے گرو نے پوچھا کہ بیٹا دوکنے میں اتنا سامان کیسے آیا۔ جواب
دیا گیا کہ گرو جی انشور کی کرپا سے یہاں ہر چیز ٹکے میر مل رہی ہے۔ گرو نے
پوچھا کہ کھایا کیا میر مل رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ٹکے میر ہر پوچھا کہ
سگ پات؟ جواب دیا کہ وہ بھی ٹکے میر، گرو نے کہا کہ بیٹا پھر تو یہ اندھیر
نگری معلوم ہوتی ہے۔ یہاں تو گھوڑے گدھے ایک ہی ٹکڑی سے
پانکے جا رہے ہیں۔

چیلے بھلا ایسے سستے شہر کو چھوڑ کر کیسے سرکتے دیں رہ پڑے
اور گرو جادواں سے چل دیئے۔ ایک روز کسی مجرم کو سولی دی جا رہی تھی۔
چیلے بھی سامنے کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے یکا یک شور مچا کہ مجرم کی
گردن پٹل ہے اور سولی کا پھندا اٹرا ہے کیا کیا جائے؟
راجہ نے حکم دیا کہ پھندا جس کی گردن میں برابر پیٹھے اُسے سولی دیا
جائے۔ چیلے سامنے تھے۔ ان کا گردن ناپا تو پھندے کے برابر اُترتی۔ فوراً
ان کو بکڑ سولی تلے آئے۔ سولی دینے سے پہلے پوچھا گیا۔ اُسے شخص
تمیری کو لے خواہش ہے جواب دیا کہ آخری وقت اپنے گرو کا دیدار چاہتا
ہوں۔ حسب خواہش بڑی تلاش سے گرو حاضر کیئے گئے۔ گرو نے یہ معاملہ
دیکھا اور راجہ سے کہا کہ اس کو بھانسی نہ دیئے، بھانسی مجھے دیکھے۔

پلے کو گرد جی کا یہ اشارہ دیکھ کر جوش آیا تو کہے لگے کہ نہیں بھانسی مجھ کو دینے
کو گرد جی کو پر گز نہ دیجئے۔

راجہ نے اس کی وجہ پوچھی تو گرد جی نے کہا کہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کچھ
میں ہے جو بھانسی پائے گا وہ آئندہ جنم میں تمام دنیا پر راج کرے گا۔
راجہ جی نے فرمایا کہ تم بھیگ بنگوان کو میرے مقابل میں راج پاٹ
کرنے کا کیا حق ہے؟ راجہ میں ہوں حکم دیا کہ ان دونوں سناسیوں کو شہر کے
بارہ پتھر باہر نکال آؤ۔ اور حفاظت تمام لے جاؤ کہ کہیں یہ کم نخت اس
اچھی گھڑی میں مرنے نہ پائیں۔

پھر خود راجہ صاحب نے سولی کے نیچے کھڑے ہو کر فرمایا کہ چلو مجھ کو
بھانسی دو۔

گرد نے چیلے سے کہا کہ چلو بیٹا، جان بچی اور لاکھوں پائے۔ دیکھ
نہیں کہتا تھا کہ اندھیر نگری چوہٹ راجا ٹکے سیر بجاتے سیر کھا جا۔

”گھر کی مرغی دال برابر“

ایک صاحب کو مرغیاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ ایک روز انھوں نے اپنے
بادرپی کو حکم دیا کہ رات کے کھانے میں مرغی بیکانہ۔ بادرپی نے کسی وجہ
سے بجائے مرغی کے دال بکا کر سامنے رکھ دی۔

مالک نے کہا کہ بے وقوف میں نے تجھ سے کہا تھا کہ مرغی بکا۔ پھر تو نے
دال کیوں بکائی؟ جواب دیا کہ سرکار مرغیاں تو گھر کی ہیں ہر وقت پنا
ہیں۔ مگر دال کا یہ ایک نیا نسخہ ہے چڑھا ہے۔ اس طرح کی ہر وقت
پنا بک سکتی۔ مالک نے کہا کہ ”گھر کی مرغی دال برابر“۔

”مضمون دونوں کا واحد ہے“

ایک نوسیکھ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے جارہے تھے۔ سامنے دیکھا کہ
ایک دوسرے صاحب بھی آہستہ آہستہ گھوڑے پر تشریف لارہے ہیں۔
اس خیال سے کہ کہیں گھوڑا بدلگای نہ کر جائے۔ نوسیکھ نے اپنا گھوڑا
روک لیا۔ تاکہ وہ صاحب نکلی جائیں اور اس عرصہ میں انھوں نے جیب سے ایک
خط نکال کر اس طرح سامنے رکھ دیا، جیسے کوئی سمجھے کہ گویا خط پڑھنے کیلئے
کھڑے ہوئے ہیں۔

اتفاق سے دوسرے صاحب بھی اناڑی تھے، گھوڑے بیٹے آہستہ
کو دیکھ کر ہنسا نا شروع کیا اور وہ بھی وہیں آکر اڑ گیا اور اس طرح اڑا کہ،
دونوں سواروں کے ہنر سے ہنر مل گئے اور دوسرے صاحب بھی ان کے خط
کو دیکھنے لگے۔

انھوں نے کہا کہ قبلہ معاف فرمائیے آپ میرا خط کیوں پڑھ رہے
ہیں۔ جواب دیا کہ خباب خط پڑھنے میں کون سا امر مانع ہے۔ مضمون دونوں
کا واحد ہے۔

عربوں کی طرافت

عربوں کا مقولہ ہے کہ **صَلَحٌ فِي الْكَلَامِ كَالْأَصْلَحِ فِي الطَّعَامِ** جس طرح تھوڑا سا لٹک کھانے کو خوش ذائقہ بنا دیتا ہے اسی طرح تھوڑی طرافت بھی بات کو چٹخارے دار بنا دیتی ہے منطقی دلائل اور فلسفیانہ انداز میں جو بات کہی جائے وہ آنا اثر نہیں دکھاتی تبنا کہ ظریفانہ رنگ میں دیکھائی جاتی ہے عربی زبان میں کثرت سے ایسی کتابیں ہیں جن میں علمی نکات لطیف طرافت کے چٹخاروں کے ساتھ موجود ہیں۔ اور تلخ ترین مقولے طرافت کی چاشنی ہے شیریں اور خوشگوار بنا دیئے گئے ہیں۔

بدیہ گولڈ اور حاضر جوابی عربوں کی گھٹی میں پڑی ہے اور سچ پوچھو تو یہی باتیں طرافت کی جان ہیں اس پر بھی عربوں نے اس فن پر کئی مستقل کتابیں تحریر کی ہیں۔ اور طرافت کے حدود متعین کر دیئے۔ تاکہ وہ اپنے حدود سے آگے بڑھنے نہ پاوے طرافت اپنے اصلی معنوں میں رہے اور وہ طرافت عامیاناں اور مکروہ الفاظوں سے بچے اور نفس نہ ہونے پائے۔

خوش طبعی، طرافت، بدیہ گولڈ اور حاضر جوابی مذاکا دیں ہے جو ہر شخص کو نصیب نہیں عرب میں بہت سے خدا کے بند بلکہ خدا رسیدہ بزرگی لیے لیے گئے جن کے دل غنچوں کا مانند زہد و تقویٰ اور معرفت الہی سے معمور اور سر بلند ہیں لیکن زبان نہ نئے نئے لگی کھلائی رہتی ہے اور جوابات ان کی زبان سے نکلتی وہ اس قدر چچی تلی اور طرافت میں ڈوبی ہوئی ہوتی کہ جیسے سن کر ان کی علمیت اور شوخ

طبی اور حاضر جوابی پر بے ساختہ داد نکل جاتی ہے۔

ان کی اس قسم کی باتوں سے کسی کا مفہم اڑانا یا کسی کو غناانا مقصود نہیں ہوتا تھا بلکہ ظرافت آمیز تقریریں اپنی محفل کیلئے تازیاں نہ ہوتے تھے۔ جن کی آواز خوشگوار اور ضرب کارگر ہوتی تھی جو تھی صدی ہجری میں ابو سعید منصور ابن الحسن

نے ایک کتاب ”نشر الدار فی الماحضرات“ لکھی ہے اس میں ظرافت کے

بعض شعبوں پر بحث کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر بیسویں حکایتیں۔ خلفائے وقت

کے مقولے، دینے میں رہنے والوں کی حاضر جوابیاں اور ان گنت دلچسپ

واقعات بیان کیے ہیں اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں ہیں ان میں ”منظر“

بہت مشہور ہے جسے آٹھویں صدی میں شیخ الامام ابو الفتح محمد بن احمد نے لکھی ہے

یہ دونوں کتابیں بے حد مقبول ہوئیں اور انگریزی، فرانسیسی، لاطینی اور فارسی

کے علاوہ دوسری زبانوں میں ان کے ترجمے شایع ہوئے اور جو پند کیے گئے۔

عموماً اس قسم کی کتابیں جن میں عربوں کے فن ماحضرات پر بحث کی گئی ہے۔ کئی

کئی بابوں پر مشتمل ہیں۔ شروع میں خدا اور رسول کے احکامات پھر ہمارے جہان و انصار

کی دلچسپ باتیں، اس کے بعد خلیفہ اور گورنروں کے پیر مذاق مقولے، اور آفریں

علماء، فضلا اور عالموں کی حاضر جوابیاں اس حسن و خوبی سے ترتیب دی گئی ہیں کہ

مطالعہ کے بعد قلب کو سکون، دماغ کو سرور و تازگی، روح کو مسرت اور طبیعت میں

ایک جولانی پیدا ہو جاتی ہے۔

نمونہ کے طور پر ان کی حاضر جوابیاں اور ذکاوت طبع کے چند نمونہ پیش

کیئے جاتے ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیے اور لطف اٹھائیے۔

عربوں کا قاعدہ ہے کہ بعض اوقات وہ شعرا تعظم کو اور انفسوں کے

واقعات بیان کرنے سے پیشتر اور واقعات کے رادوں کا سلسلہ بھی اصلی

بیان کرنے والے اصحاب تک پہنچا دیتے ہیں مثلاً کسی لطیفے کو بیان کرنے سے

پشتر وہ لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کو ایک شمعِ قائم لطیفہ گو نے سن لیا اور قائم نے یہ ذکر اپنے باپ قدیر مفتی سے سنا اور قدیر نے اپنے والد اسماعیل سے سنا اور اسماعیل نے جیل سے سنا جس کا خود یہ بیان ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ کس قدر محنت اور مشقت برداشت کر کے اصلی واقعات فراہم کرنے کا کوشش کرتے تھے۔ پھر ان میں اگر کوئی راوی مستند نہیں ہوتا تھا تو صحیح تسلیم نہ کرتے تھے ایک محدث کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ وہ اور ایک عیالی دونوں ایک ہی کشتی میں بیٹھے ہوئے سفر کر رہے تھے عیالی بیمار تھا اس لیے اس نے ایک شراب کی بوتلی نکالی اور ایک گلاس بھر کر پیئے سے پہلے ہم سفر مسلمان کو پیش کیا محدث صاحب پیاسے تھے وہ بے تکلف پی گئے اور پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے۔ عیالی نے جواب دیا کہ یہ شراب ہے۔ محدث نے کہا کہ بھلا تجھے کیوں کر معلوم ہوا کہ یہ شراب ہے؟ جواب دیا کہ میرا غلام اس کو پہچان دیا کہ وہ کالے سے خرید کر لایا تھا۔ اور اسی یہودی نے کہا کہ یہ شراب ہے۔

محدث نے کہا کہ تم عجیب ضعیف الاعتقاد اور بے وقوف آدمی ہو۔

میاں ہم محدث ہیں معتبر اور مستند اشخاص کا روایت قبول کرتے ہیں پھر بھلا ایک آدمی غلام کے اعتبار پر جس نے ایک یہودی کا سے سنا ہوا تیسرا ایک عیالی کے بات کا کیوں کر یقین کریں کہ یہ شراب ہے میں نے اس کو ضعیف اسناد کی وجہ سے پیاسے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران پر حملہ کیا گیا۔ ایران کے بادشاہ نے عربی سپاہیوں کا سیدھی سادی حالت اور معمولی کپڑے دیکھ کر کہا کہ ان فقروں کی جھولیوں میں تھوڑی سی خاک بھر دو۔ عرب یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ یہ تو مبارک فال ہے اس نے ہم کو اپنی مٹی (یعنی زمین) بخیر لڑے بھڑے دے دی ساتویں صدی عیسوی میں

عبدالملک بن مردان خاندان نبی اُمیہ کے تیسرے خلیفہ اور نہایت
ابوالعزم بادشاہ تخت نشینی سے پہلے مدینہ منورہ میں علم دین نہایت محنت و مشقت
سے حاصل کرتے رہے اور وہ کبھی عبادت گاہ سے باہر نہیں نکلتے تھے اس لیے
لوگ انہیں مسجد کا کبوتر کہا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ عبدالملک بن مردان سے کسی فقیر نے کہا کہ خدا کے واسطے
مجھے کچھ خیرات دے۔ جواب دیا کہ ”مجھ سے کیا مانگتا ہے“ جا خدا سے مانگ
فقیر نے کہا ”خوب مجھ کو خدا نے تیرے پاس بھیجا ہے۔ اور پھر مجھے اللہ خدا
کے پاس بھیج رہا ہے۔“

ہارون رشید بغداد کے خلیفہ عباسیہ میں سے پانچویں خلیفہ تھے اور تمام
خلفاؤ سے بڑھ کر فاضل، فصیح فیاض اور سخی تھے۔ ہارون رشید کے دربار
میں ہر قسم کے لوگوں کا مجمع رہتا تھا۔ علما و فضلا و شعراء سے لے کر ظریف اور
منحرفے تک موجود رہتے تھے۔ جو حاضر جواب، لطیف گو، اور سخن نہیں گان تھے
ایک مرتبہ جعفر برکی اور خلیفہ کہیں سیر کرنے جا رہے تھے۔ دیکھا
کہ اونٹ زرد جواہرات سے لہے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ خلیفہ نے
پوچھا کہ اونٹ کہاں سے آرہے ہیں۔ ساربان نے جواب دیا کہ امیر المومنین
علی بن عیسیٰ نے آپ کو خراسان سے یہ تحفہ بھیجا ہے۔ چونکہ خلیفہ نے جعفر برکی
کے بھائی قاضی برکی کو خراسان کی گورنری سے علی و کر کے علی بن عیسیٰ کو
گورنر مقرر کیا تھا اس لیے جعفر برکی سے مخاطب ہو کر مذاقاً کہا کہ تیرے بھائی
کے زمانہ میں بد زرد جواہرات کہاں تھے؟

جعفر نے دست لبتہ عرض کی کہ حضور! یہ اس وقت اپنے حقیقی مالکوں
کے خزانہ ہیں۔

ایک مرتبہ کسی شخص کو کسی الزام میں مافوق ذکر کے خلیفہ کے دربار میں

لٹے خلیفہ نے پوچھا کہ لوگوں نے جو تجھ پر الزام لگایا ہے کیا وہ صحیح ہے؟
جواب دیا کہ بھلا لوگ میرے عقیدے سے کسی طرح واقف ہو سکتے ہیں۔ واقعہ
یہ ہے کہ میں شریعہ کے حکم کے مطابق پانچویں وقت کی نماز پڑھتا ہوں روزے رکھتا
ہوں پھر بھلا اور کیا چاہیئے۔ خلیفہ نے کہا اگر تو اپنے طہ سے اقرار نہیں
کرے گا تو میں دڑے مار مار کر تجھ سے اقرار کراؤں گا۔ اس شخص نے کہا کہ کیا خوب!
آپ کے باپ دادا، دڑے مار مار کر اسلام کی صداقت کا اقرار کراتے تھے اور
آپ اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ دڑے مار کر مجھ سے طہ کا اقرار کرائیں۔
ایک روز ہارون رشید اور زبیدہ میں فالودہ اور لوزینہ کے بارے میں بحث
ہوئی کہ وہ دونوں میں کون سا زیادہ خوش ذائقہ اور مزیدار ہے۔ فیصلہ کے واسطے
قاضی ابویوسف مقرر ہوئے انہوں نے کہا کہ غائب پر حکم نہیں لگا سکتا دونوں
جسیریں حاضر کی گئیں قاضی صاحب نے دونوں کو یکے بعد دیگرے کھانا شروع
کیا یہاں تک کہ فالودہ اور لوزینہ دونوں آدھے آدھے رہ گئے اور کہا کیا ،
امیر المومنین میں کوئی حکم نہیں لگا سکتا ہوں اس لئے کہ جب ایک کو بہتر کہتا ہوں
تو دوسرا اپنی فضیلت کی دلیل پیش کر دیتا ہے۔

خلیفہ نے ایک مرتبہ بہلول سے کہا کہ کیا تم خلیفہ بننا چاہتے ہو۔ اس
نے جواب دیا کہ نہیں! خلیفہ نے پھر پوچھا کہ آخر کیوں؟ خلیفہ بننا نہیں چاہتے؟
اس نے جواب دیا کہ احمیہ کر میں میں خلیفہ کے خزانے دیکھ چکا ہوں اور تمہارے
اب تک ایک بہلول کا خزانہ ہی نہیں دیکھا ہوگا!
ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک شخص نے خدائی کا دعویٰ کیا خلیفہ نے
پوچھا کیا کہتا ہے؟

جواب دیا کہ میں خدا ہوں، میری خدائی قبول کرو خلیفہ نے کہا کہ چند روز ہو
ایک شخص نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا میں نے اسے سوائے پر لٹکوا دیا۔ اس نے جواب دیا

کہ شاہی قونے بہت اچھا کیا میں نے اسے پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ !

ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک شخص نبوت کا دعویٰ کیا وہ ہارون رشید کے سامنے آیا تو رشید نے اس سے پوچھا کہ تمہارے دعویٰ کی دلیل کیا ہے۔ کہا کہ جو کچھ آپ چاہتے ہیں پوچھیے۔ رشید نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہ امیر و غلام جو سامنے کھڑے ہوئے ہیں ان کے چہروں پر داڑھی نکل آئے۔ اس نے تھوڑی دیر سوچ کر جواب دیا یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ خوبصورت چہرے ایک بار داڑھی دار ہو جائیں، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ داڑھی دار چہرے ایک منٹ میں برباد ہو جائیں۔

ایک مرتبہ ہارون رشید کورات کو نیند نہیں آئی۔ اس نے اپنے وزیر جعفر بن یحییٰ برکی کو بلوایا اور کہا کہ مجھ کو نیند نہ آنے سے تکلیف ہو رہی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے اتفاق سے اس وقت ہارون الرشید کا غلام مسرور وہاں کھڑا تھا وہ ہنس پڑا جس پر رشید کو غصہ آیا اور کہا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے مسرور نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین معاذ اللہ میں کسی اور وجہ سے نہیں ہنسا تھا بلکہ مجھے اس وقت اس وجہ سے ہنسی آئی کہ کل کا ایک واقعہ یاد آ گیا اور یہ کہ میں محل شاہی سے نکلا اور ٹہلتے ٹہلتے دجلہ کے کنارے پہنچ گیا دیکھا کہ ایک زبردست مجمع ہے اور ایک شخص کہ جس کا نام ابن المغازی ہے کھڑا ہوا لوگوں کو ہنسا رہا ہے اس وقت مجھے کچھ باتیں یاد آئیں جن سے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ خلیفہ نے کہا کہ اچھا ابھی جا اور اس کو جلد بٹا کر لے آ۔ یہ حکم پا کر مسرور فوراً روانہ ہوا اور اس کے پاس پہنچ کر کہا کہ جلدی حل امیر المؤمنین نے مجھ کو یاد کیلئے۔ ابن المغازی نے کہا کہ بسم اللہ میں تیار ہوں۔ مسرور نے کہا کہ مگر میں تم کو ایک شرط پر لے چلتا ہوں اور وہ یہ کہ تمہیں جو کچھ ملے اس میں سے ایک جو تھلا میری۔ ابن المغازی نے کہا کہ نہیں نصف نصف رکھو مسرور نے انکار کیا القسم معاً اس پر ملے ہوا ایک ثلث۔ ابن المغازی نے کو ملے اور دو ثلث مسرور

جب یہ شرط طے ہو گئی تو دونوں رشید کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابن المغازلی نے رشید کو نہایت ادب سے سلام کیا۔ اور پُر لطف باتیں کرنے لگا۔ رشید نے کہا کہ اگر اس وقت تو مجھ کو ہنسنا دے گا تو مجھے پانچ سو دینار دوں گا۔ اور اگر نہ ہنسایا تو اس کوڑے سے تین ضربیں لگا دوں گا۔ ابن المغازلی نے اسے منظور کیا اور مذاق کی باتیں اور عجیب عجیب قسم کی تمسخرانہ حرکتیں کرنے شروع کیں جس سے چٹھر کو بھی ہنسی آ جاتی مگر اتفاق سے رشید پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تک بھی نہ آئی یہ دیکھ کر وہ مسخرا اپنے دل میں بہت ڈرا رشید نے کہا کہ تم بچاٹے انعام کے اب مزاح کے متحق ہو۔ اور یہ کہہ کر اپنا کوڑا اٹھایا جس میں چار تیسے لگے ہوئے تھے۔ جون ہی اس کو ایک ضرب پڑی وہ مسخرا زور سے چیخا اور اس کو مسرور کی وہ شرط یاد آ گئی سارا واقعہ عرض کیا۔ اور آخر میں کہا کہ امیر المومنین میرا حقہ مجھ کو ملی چکا اب مسرور کے دو حقے اسکو ملنا چاہیں۔ اس پر رشید مسکرایا۔ اور مسرور کو بٹاکر ایک کوڑا مارا وہ چلایا اور عرض کی کہ یا امیر المومنین میں نے اپنا باقی حقہ اسی شخص کو چھہ کر دیا۔ اس پر رشید کو بہت ہنسی آئی۔ اور دونوں کو پانچ پانچ سو دینار انعام دیئے۔

ایک دن خلیفہ ہارون الرشید شاہزادہ ابراہیم کے ساتھ کشتی میں بیٹھا ہوا جا رہا ہے ہارون الرشید نے کہا کہ دنیا میں بہترین نام کون سا ہے جواب دیا کہ پیغمبر کا پھر کہا کہ اللہ کے بعد تو جواب دیا کہ امیر المومنین کا نام بہتر ہے۔ ہارون الرشید نے پھر پوچھا کہ تمہارے نزدیک سب سے بہتر قسمت نام کس کا ہے؟ جواب دیا کہ ابراہیم کا نام بہت ہی قسمت ہوتا ہے۔ ہارون الرشید نے کہا کہ شرم کر یہ نام تو خلیل اللہ کا ہے۔ عرض کی کہ میرا تو دعویٰ سچ ہے اس نام کا وہ جسے خلیل اللہ کو سرود کے ہاتھوں سے بہت اذیت پہنچی ہے۔ اس پر خلیفہ نے پھر

اعتراف کیا کہ ہمارے پیغمبر برحق کے طفل، خور و سال بھی یہی نام تھا اگر اس کا بھی کوئی دوسرا نام ہو تو وہ ضرور زندہ رہتا خلیفہ نے کہا کہ تم امام ابراہیم کے نسبت کیا کہتے ہو؟ جواب دیا کہ ان پر خدا کی رحمت ہو۔ مروان الجندی نے ان کو بجھے ہوئے چوڑے کے پھلے میں بند کر کے مار ڈالا جس کے علاوہ ابراہیم ابن امولید جو خلفائے بنی امیہ میں سے تھے مغرورل کئے گئے اور، ابراہیم ابن عبداللہ ابن الحسن علوی بھی شہید کیے گئے۔ مختصر یہ کہ جس شخص کا نام ابراہیم تھا یا تو قتل ہوا یا تازیا نے لگاٹے گئے یا جلا وطن ہوا یا تکلیف میں مبتلا رہا۔ یہ تقریر ختم ہوا تو بھی کہ خلیفہ کے اسی کشتی کے پیک مار نے دوسرے ملاح ابراہیم کو پکارا۔ اور اسے گالیاں دیں ابراہیم نے خلیفہ سے عرض کیا کہ دیکھ لیجئے یہاں بھی ابراہیم کو گالیاں پڑھ رہی ہیں۔ یہ سن کر خلیفہ کو ہنسی آگئی اور دیر تک ہنسا رہا۔ !

ابو نواس کثرت سے شراب پیتا تھا ایک روز خلیفہ اسے تنہا کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کم بخت یہ کیا غضب کرتا ہے، شراب ترک کر دے یہ بہت بُری چیز ہے۔ اس کا اول بھی خراب ہے اور آخر بھی خراب ہے۔ ابو نواس نہایت خاموشی کے ساتھ منتا رہا پھر عرض کیا کہ حضور نے اُجس کے اول اور آخرت کا ذکر کیا مگر اوسط کا ذکر نہیں فرمایا جو ایسا ہے کہ آپ کی تمام مملکت ایک طرف اور اس کا ایک گھونٹ ایک طرف

ایک بار ہارون رشید، حمید طوسی سے ناراض ہوا اور حکم دیا کہ اسی جگہ فوراً قتل کر دیا جائے یہ سن کر حمید رونے لگا۔ خلیفہ نے پوچھا کہ تو کوئی نئے رد تلبہ ہے؟ جواب دیا کہ امیر المومنین میں مرنے کے ڈر سے نہیں رو رہا ہوں

موت تو ہر شخص کیلئے عام ہے لیکن مجھے اس بات پر رونا آتا ہے کہ افسوس میں دنیا سے امیر المومنین کی خفگی کے دوران میں روانہ ہو رہا ہوں ہارون الرشید کے بعد جب امن نے منہ خلافت خالی کی تو مامون رشید تخت نشین ہوا یہ زبردست عالم و فاضل ہونے کے علاوہ حسن تقریر، برجستہ گوئی اور شاعری میں کامل کا درجہ رکھتا تھا۔

ایک شخص مامون کے پاس آیا اور کہا کہ میں بنی ہوں۔ مامون نے کہا کہ اس کا کیا ثبوت ہے جواب دیا کہ آپ کے دل کی بات جانتا ہوں۔ کچھ تباؤ اس نے جواب دیا کہ آپ کے دل میں میرے کہ میں جھوٹا ہوں۔ مامون نے کہا کہ تم سچ کہتے ہو۔ اور اس کو قید خانہ بھجوا دیا تھوڑے روز بعد پھر بلوایا اور پوچھا کہ پھر کوئی وحی آئی۔ کیا نہیں، پوچھا کیوں نہیں آئی؟ اس نے جواب دیا کہ ملائکہ قید خانہ میں آنا پسند نہیں کرتے۔ مامون ہنسنا اور اس کو بچھوڑ دیا۔

ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ میں عیسیٰ ہوں۔ مامون نے کہا عیسیٰ مردہ کو زندہ کرتے تھے کیا تو وہ مغرہ دکھا سکتا ہے اس نے جواب دیا کہ براہِ بردیکھا سکتا ہوں اور کہا کہ اگر آپ اہانت دیں تو ابھی قاضی یحییٰ بن اکثر کا گردن مارتا ہوں اور ایک منٹ میں آپیں زندہ کر دیتا ہوں۔ قاضی صاحب گھبرا کے بولے کہ بھائی مجھ کو معاف کر دو۔ میں تم پر ایمان لے آیا!

ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ میں پیغمبر ہوں۔ مامون نے کہا کہ اگر اس وقت تو ایک تازہ خر بوزہ اپنے پاس سے نکلے تو میں تجھ پر ایمان لے آتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ تین روز کی چہلت دیجیے۔ مامون نے کہا کہ چہلت و ہلت کچھ نہیں ملتی۔ میں ابھی چاہتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ خود،

اللہ بیاں خربوزہ کو تین چغیر میں پیدا کرتا ہے تو آپ تین دن بھی صبر نہیں کرتے۔

مامون کے زمانہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا لوگ اس کو مامون کے پاس لائے اور اس سے معجزہ طلب کیا۔ اس نے کہا کہ میں تمہارے سامنے کچھ کنکر پانی میں ڈالتا ہوں اور وہ سب کے سب گھٹل جائیں گے اس کے بعد اس نے چند کنکر اپنی جیب سے نکالے اور پانی میں پھینکا دیئے۔ وہ سب گھٹل گئے لوگوں نے کہا کہ اس کی سند نہیں ہم تم کو اپنے کنکر دیتے ہیں ان کو پگھلاؤ تو جانیں۔ اس نے جواب دیا کہ تم لوگ فرعون سے بڑھ کر نہیں اور میں موسیٰؑ سے بڑھ کر نہیں جب موسیٰؑ اپنا عصا نکالتے تھے وہ آثر دھا بن جاتا تھا تو کیا فرعون ان سے یہ کہتا تھا کہ ہمارے عصا کا آثر دھا بناؤ۔ مامون اس جواب سے ہنا اور اُسے چھوڑ دیا۔

مختم کے زمانہ میں ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ وہ موسیٰؑ کا خلیفہ ہے کیا تم کس پر بھیجے گئے ہو؟
جواب دیا کہ تم پر، خلیفہ نے کہا کہ موسیٰؑ علیہ السلام کا عصا آثر دھا بن جاتا تھا تو بھی وہ معجزہ تباہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس زمانہ میں فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اس لیے موسیٰؑ کو اس معجزہ کا ضرورت پڑی تھی۔ اگر تم بھی خدائی کا دعویٰ کرو تو میں وہ معجزہ تباہ کیا ہوں خلیفہ نے کہا تو احمق ہے۔ اس نے جواب دیا کہ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ پیغمبر اپنی ہی قوم کی طرف مبعوث ہوتے ہیں۔ جیسی قوم ہوتی ہے ویسا ہی پیغمبر ہوتا ہے۔

ایک جلد باز اعرابی امام کے چچے نیت باندھ کر بازار پر چلے گئے

ہو گیا امام نے سورۃ فاتحہ کے بعد یہ آیت قرات کی، اِنَّا ارسلنا نوحًا اِلٰی قَوْمِهِ
 اِہْم۔ نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا مگر آگے بھول گیا اور بار بار ایسی آیت
 کو دہرانے لگا اعرابی سے خاموش نہ رہا گی۔ فوراً بول اُٹھا کہ ارے بھائی اب
 نوح کے بعد کسی دوسرے کو بھیج کہ تجھے بھی آرام ملے اور ہم بھی اس گرداب سے
 نجات پائیں۔

ایک اعرابی نے جس کا نام موسیٰ تھا کچھ درہم چُرا کر اپنے ہاتھ میں چُپھا
 لیے۔ اور چُپکے سے نیت باندھ جماعت کے ساتھ نماز میں شریک ہو گیا امام نے
 قرات شروع کی۔ و مَا تَلٰکَ بِمِیْنٰکَ یَا مُوْسٰی (اے موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟)
 یہ سن کر موسیٰ اعرابی کا دل دھک سے ہو گیا فوراً درہم امام کے سامنے پھینک یہ
 کہتا ہوا بھاگا کہ واللہ تم لوگ ساحر ہو ساحر۔!

ایک عورت نے کسی موزن کو صبح کی اذان آفتاب نکلنے کے بعد دیتے ہوئے
 سنا جب موزن نے کہا کہ الصلوٰۃ خیرٌ من الغو (نماز سونے سے بہتر ہے) تو عورت
 نے کہا کہ موزن صاحب! آپ کو تو اس وقت یہ کہنا چاہیے کہ الغوٌ خیرٌ من ہٰذہ
 الصلوٰۃ (سونا ایسی نماز سے بہتر ہے)

ایک عورت نماز پڑھنے مسجد میں آئی۔ امام نے قرات کی فائیکوا! اطاب
 لکم من النساء (نکاح کرو عورتوں سے جتنی تمہاری خواہش ہو) عورت یہ سن کر
 بہت خائف ہوئی اور نیت توڑ کر سیدھی گھر پہنچی اور اپنی بہن سے کہا کہ اب میں ہرگز
 مسجد میں نماز پڑھنے نہیں جاؤں گی کم بخت امام لوگوں سے بار بار یہی کہتا تھا
 کہ ہمارے ساتھ شادی کریں۔ اُس وقت مجھے ڈر معلوم ہوا کہ نماز ختم کرنے
 کے بعد یہ شب کے سب میرے ساتھ نکاح نہ کر ڈالے۔!

ایک اعرابی ایسی مجلس میں آیا جہاں رات کو جاگنے اور عبادت الہی میں مشغول رہنے کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی لوگوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم بھی جاگتے ہو؟ کہا ہاں! پوچھا کیا کرتے ہو۔ جواب دیا کہ کیا کرتا ہوں! پیشاب کر کے پھر سو رہتا ہوں۔

ایک سائل نے کسی دروازے پر آکر سوال کیا صاحب خانہ نے کہا کہ برکت ہے۔ اس نے کہل کے تھوڑے سے جو بھی دید؟ جواب دیا کہ نہیں ہیں پھر کیا کہ ذرا سا زیتون کا تیل ہی دید؟ جواب دیا کہ یہ بھی نہیں ہے۔ پھر کہا کہ اچھا بابا تھوڑا سا پانی پلاؤ! کہا کہ یہ بھی اس وقت موجود نہیں ہے۔ سائل نے کہا کہ پھر تم لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ آؤ میرے ساتھ چلا کر بھیک مانگو تم تو مجھ سے بھی زیادہ بھیک کے مستحق ہو۔!

عبداللہ بن معاویہ (رزید کا سوتلا بھائی) حماقت میں مشہور تھا) ایک روز اس نے راستہ میں دیکھا کہ ایک آٹا پیسنے والا اپنی چمکی حجر کے ذریعہ چلا رہا ہے اور حجر کے گلے میں گھنٹیاں پڑی ہیں۔ عبداللہ نے پوچھا کہ یہ گھنٹیاں، کیوں باندھ رکھی ہیں۔ جواب دیا کہ اگر حجر چلتے چلتے پھر جاٹے تو معلوم ہو جاٹے گا۔ عبداللہ نے کہا کہ فرض کرو کہ حجر چلتے چلتے پھر جاٹے، اور کھڑے ہو کر صرف اپنا سر ہلاتا رہے تو پھر تم کس طرح معلوم کرو گے؟ اس نے جواب دیا کہ خدا امیر کو سلامت رکھے امیر کا سی عقل میرے حجر میں کہاں ہے۔

تاضی ابو صہبام، میں دود آدمی آٹے ایک طنبورہ کے معاملہ میں جھگڑا تھا۔ تاضی نے مدعی سے پوچھا کہ تمہارے گواہ ہیں! کہا جی ہاں اور گواہی میں دوا دیوں کو پیش کیا۔

۱۱۱
 مدعی نے قاضی سے کہا کہ حضور ان گواہوں کا پیشہ تو دریافت فرمالیجئے۔
 قاضی نے ان کا پیشہ پوچھا ایک نے کہا میں طبیبی ہوں اور دوسرے نے کہا میں گویا ہوں۔
 قاضی نے مدعی علیہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ طنبورہ کے واسطے ان دونوں
 سے بڑھ کر کوئی اور بہتر اور موزوں گواہ نہیں مل سکتا اور طنبورہ مدعی کو دلا دیا۔

ابو ایوب سے کسی نے پوچھا کہ مسافر کو اگر جنگلی میں کعبہ کی سمت نہ معلوم ہو
 تو کدھر منہ کر کے نماز پڑھے۔ جواب دیا کہ اگر سمت کا پتہ نہ چلے تو سامان کی طرف
 منہ کر کے نماز پڑھے تاکہ وہ چوری نہ جانے پڑے۔

ایک شخص کے گھر کی چھت بہت بوسیدہ تھی اور لکڑیوں میں سے آواز آتی
 رہتی تھی۔ جب مالک مکان کرایہ لینے کیلئے آیا تو کرایہ دار نے کہا کہ قبلہ اس
 کے چھت کی لکڑیاں بدلوادیجئے اُدپر سے برابر چٹ چٹ کی آوازیں آتی رہتی
 ہیں اس نے ہنس کر کہا کہ کوئی خوف کی بات نہیں ہے چھت اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی
 رہتی ہے کرایہ دار نے کہا کہ مجھے اور تو کوئی خوف نہیں مگر صرف خوفِ اسماء بات
 کا ہے کہ کہیں چھت تسبیح و تحلیل کرتے کرتے سمجہ میں نہ آ پڑے۔

ایک عورت نے قاضی کے پاس آ کر اپنے شوہر سے علیحدگی کی درخواست
 دی اور وجہ یہ بتائی کہ وہ ہر روز رات کو کچھونے میں موت دیتا ہے شوہر نے
 کہا کہ آپ اس معاملہ میں جلدی نہ فرمائیں، پہلے میرا قصہ سن لیں۔ بات یہ ہے
 کہ میں روز رات کو خواب دیکھتا ہوں کہ گویا میں ایک جزیرہ میں ہوں اور
 عالیشان محل ہے اور اس محل پر ایک بلند مینارہ ہے اور اس مینارہ پر ایک
 اونٹ کھڑا ہے اور میں اس اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھا ہوں اور وہ اونٹ سمندر

میں نے پانی پیئے پکٹے اپنی گردن جھکا رہا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں تو ناراض
 ڈر کے میرا پیشاب خطا ہو جاتا ہے۔ قاضی صاحب نے جب یہ سنا تو دہریے
 بیٹھے فرشتے کو گینا کر دیا۔ !

کسی نے ایک موزن کو دیکھا کہ اذان کہتا جاتا اور بھاگتا جاتا تھا۔
 لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ کہا میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میری
 آواز کتنی دور تک پہنچتی ہے۔ !

ایک موزن صاحب کو کسی نے دیکھا کہ وہ اذان دیتے جاتے تھے اور
 کاغذ دیکھتے جاتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ حرکت ہے؟ جواب دیا اس کا
 حال قاضی سے پوچھیے۔ لوگ قاضی صاحب کے پاس پہنچے اور السلام علیکم
 قاضی نے فوراً ایک کتاب کھولی اور اس کے صفحات لٹے شردا کر دیئے آخر
 ایک مقام کو دیکھ کر جواب دیا وعلیکم السلام لوگوں نے قاضی کی یہ حالت
 دیکھ کر موزن کو معاف کر دیا۔

ایک روز جی ایک مزدور کے سر پر آٹا لے ہوئے جا رہا تھا راستہ سے
 مزدور بھاگ گیا۔ چند روز بعد جی نے اس کو دیکھا تو یہ اس ڈر سے ایک
 جھاڑ کے پیچھے چھپ گیا کہ کہیں وہ مزدوری نہ مانگ بیٹھے۔

ایک روز ابن الجباص وزیر ابن الغزرت کے ساتھ کشتی میں بیٹھا ہوا جا رہا
 تھا اس کے پاس ایک خبر بوزہ تھا جو وہ وزیر کو دینا چاہتا تھا اور ہنہ میں تھا کہ
 ”اے دریا میں تھوکتا چاہتا تھا حاتم سے وزیر کے ہاتھ میں تھوکتا کر“

ایک چور دوکان سے گھڑا چرا کر لے چلا۔ لوگوں نے گرفتار کر لیا اور کہا کہ تجھ پر خدا کی ماردن دہاڑے گھڑا چرا کر لئے جا رہا ہے۔ اُس نے کہا کہ خدا عظیم ہے یہ گھڑا تمہارا نہیں ہے یہ تو میرے پاس اس زمانہ سے ہے جب کہ یہ ایک چھوٹا سا پیالہ تھا اور اب بڑھتے بڑھتے یہ گھڑا ہو گیا ہے۔

شیخ سعدی کو سماع کا چکا پڑ گیا تھا اس باب میں کسی کی نصیحت اسے کارگر نہیں ہوتی تھی ایک روز کسی مجلس میں اس کو ایک بدآواز سے پالا پڑا اور ساری رات اس مکروہ صحبت میں بسر ہوئی۔ صحبت کے ختم ہونے پر آپ نے سر سے منڈا سا اتارا اور جیب میں سے ایک دنیا نکالا۔ اور یہ دونوں چیزیں قوالی کے نذر کیں۔ اصحاب مجلس کو اس حرکت سے تعجب ہوا۔ شیخ نے یاروں سے کہا کہ میں نے آج اس شخص کی کرامت مشاہدہ کی ہے میرا دل ہمیشہ سماع سے منع کرتا تھا مگر میں نے اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اور برابر سماع میں شریک ہوتا رہا۔ آج خوش قسمتی سے اس مبارک جلمہ میں آنا ہوا اور اس بزرگوار قوال کے تصرف سے میں نے ہمیشہ سچلے سماع سے توبہ کی۔

ایک بار خواجہ شمس الدین پانچ سو دنیا ر بطور نذر کے اپنے غلام کے ہاتھ دار السلطنت تبریز سے شیخ کے خدمت میں بھیجے۔ راہ میں غلام نے اس میں سے ڈیڑھ سو دنیا نکال لیئے۔ اور ساڑھے تین سو شیخ کے حوالے کیئے شیخ نے دیکھا کہ صاحب دیوان کے خط میں پانچ سو لکھے ہیں اور غلام نے ساڑھے تین سو دیئے ہیں۔ اس لئے اس کی رسید میں یہ قلمہ لکھ کر بھیجا تھا

خواجہ نضر رتم فرستادی و مال بہت افزوں بادخصت پائیسال
 ہر بد باریت سارے عمر باد تا پائیسال صد و پنجاہ سال
 تم نے مجھے عزت دی اور نقدی بھی سارے دوست زیادہ اور شمع پامال ہو
 تمہاری عمر فی دینار ایک ہر ملک کے حساب سے ہو جیو تاکہ تم ساڑے تین سو برس
 دینار میں رہو۔

ساتویں صدی عیسوی میں عبدالملک بن مردان خاندان بنی امیہ کے
 تیسرے خلیفہ نہایت الو الغرم بادشاہ تھا تخت نشینی سے پہلے مدینہ منورہ میں
 علم دیں نہایت محنت اور مشقت سے حاصل کرتے رہے اور وہ کبھی مزار
 پاک سے باہر نہیں نکلتے تھے اس لئے لوگ انہیں مسجد کا بھوترہ کہا کرتے تھے۔
 ایک مرتبہ ابن ملک بن مردان سے کسی فقیر نے کہا کہ خدا کے واسطے
 مجھے کچھ خیرات دے؟ جواب دیا کہ مجھ سے کیا مانگتا ہے جاہل سے مانگ
 فقیر نے کہا کہ کیا خوب مجھ کو خدا نے تیرے پاس بھیجا ہے اور تو مجھے خدا کے
 پاس بھیج رہا ہے۔

خلیفہ عبدالملک کے زمانہ میں جمیل اور عقیقہ کے صن و شقی کے
 چرچے ہو رہے تھے۔ خلیفہ ان کے دیکھنے کا بہت مشتاق ہوا ایک روز عقیقہ
 کو دربار میں طلب کیا تو دیکھا کہ وہ نہایت بد شکل اور بد صورت ہے خلیفہ نے
 پوچھا کہ جمیل نے مجھ میں ایسی کونسی خوبی دیکھی جو فریفتہ ہو گیا۔ اس نے
 جواب دیا کہ امیر المومنین! لوگوں نے آپ میں ایسی کونسی خوبی دیکھی جو اپنا
 خلیفہ بنالیا۔

عمر ابن الغریزہ یوے بہت کھاتے تھے ایک روز کسی نے لبنان

کے سب بلور سوغات لا کر دیئے۔ خلیفہ نے انہیں لینے سے انکار کیا۔ کہنے لگا کہ جب رسولؐ اس قسم کے تحفے قبول فرماتے تھے تو پھر آپؐ کیوں انکار فرماتے ہیں۔ جواب دیا کہ اے امیر! یہ تحفے رسولؐ خدا تک تو واقعی تحفے تھے مگر میرے لیے تو رشوت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ بجلی زوروں سے چمک رہی تھی، سیاہ بادل اٹھ اٹھ کر گرج رہے تھے آندھی نے ایک طوفان برپا کر رکھا تھا اور لوگ مارے خوف کے گھروں میں چھپ رہے تھے اس قیامت خیز سماں کو دیکھ کر خلیفہ نے کہا کہ بھائیو! یہ تو خدا تعالیٰ کے رحم کی کیفیت ہے پھر خدا معلوم اس کا غضب کس بلا کا ہوگا۔

ایک روز خلیفہ نے فرمایا کہ انسان کا دل رازوں کا خزانہ ہے۔ ہونٹ تفل ہیں اور زبان اس کی کبھی ہے اس لیے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے خزانہ کی کبھی کا اچھی طرح سے حفاظت کرتا رہے۔

مدینہ کے رہنے والوں کے قصے:۔ کسی آشوریا کے رہنے والے نے ایک مدینہ والے سے پوچھا کہ تمہارے ہاں شراب کا کیا بھاؤ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک درہم میں دو بوتلیں اور پچھتر درے۔

کسی شخص نے ایک مدینہ کے رہنے والے سے پوچھا کہ یہاں کے لوگ، جاڑا کس طرح گزارتے ہیں اس نے جواب دیا کہ امیر الحاف اوڑھ کر اور غریب دانت سے دانت بجا کر۔

ایک مدینہ کا رہنے والا تنگ دستی کے ہاتھوں دھاروں مار مار کر روہا تھا کسی نے کہا کہ خدا پر بھروسہ رکھو اچھے دن بھی آجائیں گے۔ جواب دیا کہ روہا ہی

ہے کہ اچھے دن آئیں اور مجھے نہ پائیں۔

ایک بردہ فروش لڑکی بیچ رہا تھا۔ کسی نے کہا میاں اس کی ٹانگیں تو ٹیرم
میں اس نے جواب دیا کہ قبلہ اس کے سر پر کسی عمارت کا وزن تو ڈالا نہیں جائیگا

کسی عرب نے ایک ستا سا گھوڑا خریدا اور چلتے وقت تا جیسے پوچھا
کہ تجھے قسم ہے اس خدا کے یاں کی بیچ تا کہ اس گھوڑے میں کوئی عیب تو نہیں
ہے۔ جواب دیا کہ بخدا کوئی عیب نہیں ہے مگر صرف اس کی ران میں ایک کھور
کے برابر زخم ہے۔ نیٹھے پر ایک انگور کے دانے برابر گھٹلی ہے اور پیٹ میں ایک
چھوٹے تر بوز کے برابر سولہ ہے عرب نے کہا ادگدھے تو گھوڑے بیٹھا ہے
یا میوے فروش کرنا ہے۔

شاہ پور میں ایک مدرسہ کی تعمیر ہو رہی تھی۔ گدھوں پر لاد کر انہیں آرم
تھیں۔ ایک گدھے کو ہر چند مدرسہ کے مہن میں کھینچ کھینچ کر لانا چاہتے تھے مگر وہ ہرگز
اندر نہیں جاتا تھا۔ اتنے میں عمر خیام کا گزرا ہوا اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو
مخاطب کر کے کہا کہ

ابے رنتم و باز آمدہ جل ہم گشتہ ہست ز میلا نا چہا گم گشتہ
ناخن ہمہ جمع آمد سم گشتہ ریش از پس پشت بر آمدہ دم گشتہ
اس رباعی کے پڑھنے کے بعد وہ گدھا مہن میں چلا گیا۔ لوگوں نے تعجب سے
پوچھا کہ یہ واقعہ کیا ہے۔ عمر خیام نے جواب دیا کہ اس کی روح پہلے جہنم میں اس
مدرسہ کی مدرسہ تھی مگر پھر حیات پائی تو اس کو اندر جانے سے ڈر معلوم
ہو گیا ہے۔

باتل عنہا تیم عرب کا مشہور احمق تھا ایک مرتبہ اس کو یہ کہنا تھا کہ کیا
کے پاس اکیس بھیڑیں ہیں۔ لفظ اکیس بھول گیا۔ اظہار مطلب کے لئے دسوں
ہاتھ کی انگلیاں اور دسوں پاؤں کی انگلیاں پھیلا کر زبان باہر نکال دی۔

حمزہ بن حبیب (عرب کا مشہور احمق) نے ایک روز اپنے بیٹے سے
پوچھا کہ بیٹا تجھے یاد ہے کہ اصفہ میں میں نے جمعہ کی نماز کس روز پڑھی تھی
اس نے سوچ کر جواب دیا کہ شاید منگل کو پڑھی تھی۔

ایک عورت نے متوکل کے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ متوکل نے
پوچھا کہ کیا تو رسول پر ایمان لائی ہے؟ کیا ہاں! متوکل نے کہا کہ انہوں نے فرمایا
ہے کہ ”و لدہ بنی لیدی“ عورت نے کہا مگر یہ تو نہیں فرمایا کہ لذ بیتہ لیدی۔

ایک روز خلیفہ متوکل نے کسی پرندے کو تاک کر ایک تیر مارا تیر خالی گیا
اور پرندہ اڑ گیا وہیں ایک عرب کھڑا تھا اس نے بے ساختہ کہا کہ مرجا! خلیفہ نے
مڑ کر کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ خدا نے اس قسم کی جھوٹی تعریف کرنے کا حمانیت
کہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے آپ کی تعریف نہیں کی بلکہ اس پرندے کی تعریف
کہا ہے جو آپ کا تیر خالی دے کر اڑ گیا۔

ایک مرتبہ خلیفہ ہمدانی شکار کھیلتے کھیلتے اپنے ہمراہیوں سے بچھڑ گئے
ایک اعرابی کے خیمہ کے پاس آئے اور کہا کہ اے شخص میں بھوکا ہوں کچھ کھانے
کو دے اعرابی روٹی لایا۔ ہمدانی نے خوب پیٹ بھر کر کھا لیا اعرابی نے پھر تھوڑا
سار دودھ اور خیند پیش کیا جیسے ہمدانی نے دو چار گلاس پیا کر کہا کہ تو جانتا ہے کہ

میں کون ہوں؟ اعرابی نے جواب دیا کہ نہیں! کیا کریں امیر المومنین کا ایک خاص ملازم ہوں۔ اعرابی نے کہا کہ بارک اللہ خدا آپ کو ترقی دے۔ پھر جہدی نے ایک اور تنبیہ کا پیالہ پیا اور پوچھا کہ تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟ اعرابی نے کہا کہ آپ امیر المومنین کے ایک خاص ملازم ہیں۔ خلیفہ نے کہا کہ نہیں بلکہ میں امیر المومنین کا ایک بڑا افسر ہوں۔ اعرابی نے کہا کہ ماشاء اللہ خدا آپ کے مرتبہ کو اور بڑھا دے اور آپ کا مرادیں پوری کرے۔

پھر خلیفہ نے تیسرا پیالہ پیا اور کہا کہ اعرابی تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں کہا ابھی آپ نے فرمایا کہ میں امیر المومنین کا بڑا افسر ہوں خلیفہ نے کہا نہیں! بلکہ میں خود امیر المومنین ہوں سن کر اعرابی نے تنبیہ کا گھڑا جلدی سے اٹھا لیا اور کہا کہ اب آپ یہاں سے جلد تشریف لے جاؤ ورنہ جو تھا پیالہ پیئے کے بعد آپ یقیناً فرما لیں گے کہ میں رسول اللہ ہوں۔

محمد جہدی اپنے والد ابو جعفر منصور کے مرنے کے بعد شہداء میں تخت نشین ہوا اور یہ خلفائے بنی عباسیہ سے شیرا خلیفہ تھا۔ جہدی عادات و اطوار میں اپنے باپ کا بالکل عکس تھا اس کے دور خلافت میں حکیم المنفع نامی نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اس نے اپنے غلی کمالات سے چاہ تخت میں سے ایک مصنوعی چاند نکالا تھا۔ جس کی روشنی ۶ میل تک پہنچتی تھی۔

ایک مرتبہ ابو الاسم جہدی کے دربار میں حاضر ہوا وہاں اسمعیل بن علی عیسیٰ بن موسیٰ اور دیگر اہلیان بنی ہاشم جمع تھے۔ جہدی نے ابو دلامہ سے کہا کہ ان لوگوں میں سے جو یہاں اس وقت موجود ہیں۔ کسی کی ہچکچاہٹ ورنہ تیری زبان کٹوا دوں گا۔ ابو دلامہ نے سب کو ایک حسرت بھری نگاہ سے دیکھا اور سناٹے میں آگیا مگر اس کو سخت تعجب ہوا جب اس نے یہ دیکھا کہ ہر شخص اشارہ کر رہا ہے کہ ہچکچاہٹ

اس حالت میں اس کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ خود اپنی ہجو کہے۔ اور فی البدیہہ یہ نظم کہی ابو دلامہ سے کہہ دے کہ تو شرافت اور بزرگی سے بالکل عاری ہے۔ کچھ میں بد صورتی اور ذلت دونوں جمع ہیں جب تو عمامہ باندھتا ہے تو بندر معلوم ہوتا ہے اور جب اتار دالتا ہے تو سور معلوم ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ خلیفہ منصور کے چہرے پر مکھی بیٹھی اس نے اڑادی وہ پھر آبیٹھی خلیفہ نے پھر اڑادی وہ پھر آبیٹھی خلیفہ نے جھبلا کر سلیمان نصیر کے جانب مخاطب ہو کر کہا کہ خدا کو مکھی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے جواب دیا۔ امیر المؤمنین 'خدا نے مکھی کو مسکروں کا غرور توڑنے کیلئے پیدا کیا ہے۔

ابو جعفر الحلقب یہ منصور خلیفہ بنی عباسیہ سے بغداد کا دوسرا خلیفہ تھا۔ عبد اللہ الصلاح خلیفہ عباسیہ کے مورخ اول ۵۳۲ھ و ۱۳۲ھ میں خلیفہ مقرر ہوا۔ یہ بڑا سخت گیر نہایت بخیل اور کنجوس تھا۔

بے وقوفوں کے قصوں میں ایک عربی قصہ اس قدر مشہور ہوا کہ تقریباً ہر قوم اور ہر ملک نے پسند کیا۔ اور کچھ تغیر کے ساتھ اپنایا ہے۔ جرمن میں وہ ڈرامہ کی شکل میں تبدیل کیا گیا اور وہ (DORTEISH 1st GREDECKT) کے نام سے مشہور ہے اور انگریزی زبان میں COLES MAKE FAMILY کے نام سے اس کا ڈرامہ تیار کیا گیا ہے۔ عربی کا اصل قصہ یہ ہے کہ ایک صاحب کی شادی ہونے قسمت دیکھنے کہ دو لہا، دایس دونوں بے وقوف تھے۔ دو لہا میاں نے اپنے یار دوستوں کو دعوت دی آدھی رات تک ناچ گانے ہوتے رہے۔ حسم ختم ہوا دو لہا میاں اپنے یار دوستوں کو رخصت کر کے واپسی پر دروازہ بند

نہیں تھا۔ میاں بیوی سے کہا دروازہ بند کر دیوی نے میاں سے کہا تم بند کرو۔
میاں نے کہا یہ تمہاری غلطی ہے۔ بیوی نے کہا کہ تمہاری غلطی ہے۔

بیوی نے کہا میں دروازہ بند نہیں کروں گا اُسے تمہیں بند کرنا ہو گا۔ میاں نے
کہا تم بیوقوف ہو۔ بیوی نے کہا تم بیوقوف ہو۔ میاں نے کہا مگر اب یہ بولو کہ یہ دروازہ
کون بند کرے گا۔ بیوی نے کہا اچھا آپ جو منہ سے پہلے بولے گا وہ دروازہ بند کرے
پھر کیا تھا دونوں کے دونوں اپنا منہ بند کر کے بیٹھ گئے۔

اب سینے اُدھر سے ایک چور گزرا۔ دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر اندر آیا
دیکھا کہ میدان خالی ہے نہایت اطمینان سے سامان سہنا شروع کر دیا۔ میاں
بیوی دونوں نے چور کو دیکھا۔ چور پھرتا پھرتا اس کمرے میں بھی آیا جہاں یہ
دونوں بیٹھے ہوئے تھے مگر دیکھا کہ دونوں بت بنے ہوئے بیٹھے ہوئے ہیں اُس
کو ایسے عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کہاں گنتے تھے دونوں کے نیچے
سے دری۔ کھنی قیمتی زیورات اتار مگر ان دونوں خدا کے بندوں نے اپنے فیصلہ کے
خلاف چوں تک نہیں کی۔

صبح کے وقت ایک پولیس آفیسر صاحب مع اپنے ساتھیوں کے گشت کرتے
ہوئے آنکلی گھر کا دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر اندر دندناتے ہوئے چلے آئے
دوہا دوہا کے کمرے میں آئے وہاں دیکھا کہ ایک مرد اور ایک عورت بچوں
کی طرح ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں۔ پولیس آفیسر نے واقعات پوچھے مگر
جواب نہ دیا وہ بار بار پوچھتا تھا اور یہ دونوں ایک کان سنتے تھے اور دوسرے
کان سے اڑا دیتے تھے۔ آخر کار پولیس آفیسر نے تھکلا کر کہا کہ ان دونوں کو کوڑے
مگر وہ بے وقوف کوڑے کھا کر بھی کچھ نہ بولے آخر کار ایک شخص کو حکم دیا کہ
تلوار سے اس مرد کا گردن اڑا دے اس نے گردن اڑانے کیلئے تلوار میدان سے
کیچی اور ڈرانے کیلئے اپنا ہاتھ اٹھایا عورت آخر عورت تھی۔ گھر آکر بولی کہ خدا کے

واسطے اسے نامار دیا تو میرا شوہر ہے۔ بیوی کی آواز سن کر شوہر کے چہرہ پر
خوشی کے آثار کا ہر ہونے لگے۔ مارے خوشی کے باچھیں کانوں تک کھل گئیں
جسینی باہر نکلا آئی، تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگا اور کہنے لگا کہ دیکھو میں آخر تک
نہیں بولا۔ پولیس افسر نے تمام واقعات سننے اور لخت ملامت کر کے چلتا بنا۔
عورت کو ہار ماننا پڑی اور سارا گھر لٹوا کر اپنی جگہ سے اٹھی اور گھر کا دروازہ
بند کر کے سو رہی۔

حافظ نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں معلموں کے متعلق بہت سے قبیح جمع کیے
تھے آخر میں اس نے خیال کیا کہ ان قصوں کو تلف کر دے اور ان بے چاروں کو بدنام
نہ کرے مگر اتفاق سے پھر کسی شہر میں گیا اور وہاں ایک معلم سے گفتگو ہوئی تو اس نے
اپنے اس ارادہ کو ترک کیا اور ان واقعات کو لکھنا ضروری سمجھا وہ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ
میں گلی میں سے گزر رہا تھا دیکھا کہ وہاں ایک معلم صاحب کھڑے ہوئے کتے کا بولا بولا ہے
میں میں وہاں ٹھہر گیا اور دیکھا کہ ایک لڑکا اس آواز سن کر اپنے گھر سے نکلا جوں ہی لڑکا
باہر آیا معلم نے اس کا گریباں پکڑ کر زور زور سے طمانچے مارنے شروع کر دیے میں نے
اس کا سبب دریافت کیا معلم نے کہا کہ یہ بڑا بد معاشر لڑکا ہے۔ پڑھنے سے ہی جراتا
ہے اور ہمیشہ گھر میں رہتا ہے۔ اس کے پاس ایک کتا ہے اور اس سے یہ ہمیشہ کھلتا رہتا ہے
اس وقت اس نے میری آواز سن کر خیل کیا کہ اس کا کتا بھونک رہا ہے۔ اہذا یہ نکلا آیا
اور میں نے اس کو اس کا بد معاشر لڑکا سزا دی۔

ایک موقع پر انہوں نے لکھا ہے کہ میں ایک کتب میں گیا دیکھا کہ معلم صاحب
دیکھتے دیکھتے ہوئے وہاں سے پوچھا کہ لڑکے کہاں ہیں جواب دیا کہ گلی میں کھیل رہے
ہیں۔ میں نے کہا ان کو دیکھنا چاہتا ہوں معلم نے کہا کہ ان کو دیکھ کر آپ بیکہ بیکہ ہلکے

میں نے کہا کہ میں ان کو ضرور دیکھوں گا کہا اگر آپ کا ایسا ہی جہا چاہتا ہے تو لگیا ہوا ہلے۔
 مگر اپنا سر اور چہرہ چھپا لیجئے ورنہ لوٹے آئے آپ کو معلم خیال کریں گے تو پھر دیکھئے
 اس وقت آپ کا کیا حال بنا ڈالیں گے۔

ایک شخص نے ایک معلم کو دیکھا کہ عصر کی نماز پڑھ رہا ہے جب وہ رکوع
 میں گیا تو اس نے اپنا وہ نوٹا نگوں کے بیچ میں سے سر نکال کر بڑکوں کو دیکھا کہ وہ
 کھیل رہے ہیں۔ جو ان میں زیادہ شرارت کر رہا تھا۔ اس سے مخاطب ہو کر کہا اے
 اوبہ معاش لوٹے میں نے تجھ کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے ذرا نماز سے فارغ ہو جوتا
 تو پھر دیکھ تیری کیسی گت بناتا ہوں۔

پرانے نالک

اندر سے پہلے

ہندستان کیلئے ڈراما یا نالک کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ تو ہمارے دیش کا پرانا فن ہے آج سے دو ہزار سال پہلے بڑے بڑے تہواروں اور جاتراؤں میں راجہ ہماراجہ کے درباروں اور محلوں میں بڑی شان و شوکت اور تزک و انتہا کے ساتھ نالک کھیلے جاتے تھے بڑے بڑے پنڈت اور ودھوہن، بڑے بڑے آرٹسٹ اور کلاکار اس میں حصہ لیتے تھے اور خراج تحسین حاصل کرتے تھے مہادیو اس اور سبھاش کے ڈرامے اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ اب تک فن کار جس کے رانگ گاتے اور رھس دھاڑی قصے سناتے رہتے ہیں۔

جب کچھ پڑھے اور شریف لوگوں نے اس فن سے ہاتھ اٹھایا تو جاہلوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پھر کیا تھا۔ بہرہ دیوں اور گولیوں نے چھوٹی چھوٹی منڈلیاں اور ٹولیاں بنائیں۔ شہر شہر گاؤں گاؤں، گھر گھر اور در در جکر لگانے شروع کر دیے جہاں چار لوگوں کو اکٹھا پایا دیں ایسا کھاڑا جمایا۔ منہ پرین کی داڑھیاں یا منڈھوں کے بال چکلیے اور بے وقت کی رانگی اپنی شروع کر دی۔ کچھ بہرہ پر بہرا کچھ نقالی اور کچھ فحش اور پھکڑنے کے قصے سنائیے چلتا تھا ختم پیسہ بھضم کج سے سو دو سو سال پہلے دہلی اور لکھنؤ میں دو چیزوں کا بہت زور تھا۔ ایک تو نقالی اور دوسری رھس۔ اس فن کے دیگر وہ ماہر مانے جاتے تھے۔ ان

میں ایک ٹولی تو کشمیری بھانڈوں کی تھی اور دوسری کھٹک اور رھس دھاڑیوں کی تھی جن کا تعلق اجودھیا اور برج سے تھا۔ مثل مشہور تھی کہ مولف سے وہ محفل کہ جہاں بھانڈز باشد۔ ہر محفل ہر جلسہ ہر تقریب اور ہر تہوار میں ان کا آنا برحق تھا۔ ان میں کرپلا، کیا خوب، کھلونا اور بادشاہ پسند کی ٹولیاں بہت مشہور تھی۔ ہر ایک ٹولی میں ایک نوخیز اور خوش رو ضرور ہوتا تھا جو عورتوں کی طرح جوڑا باندھے کنگھی چوٹی سے درست، سرمہ مٹی لگائے اور کیل کانٹے سے لیس پاؤں میں گھنگرڈ باندھے کرنا چھاتا اور اپنی پھرتیلی اداؤں اور غیر معمولی چلت پھرت سے محفل میں گرمی جوش اور تازگی پیدا کر دیتا تھا۔ آخر میں بھانڈ بندہ سنجی اور نقالی کے کمال دکھاتے تھے اور ناشائستہ ریمارک فحش قصوں اور خلاف تہذیب مکالموں سے اہل محفل کے دلوں کو گدگداتے اور لوگوں کو ہنسواتے رہتے تھے۔

رھس دھاڑیوں کے طالعوں کا بھی قریب قریب یہی رنگ تھا مگر ان کا ہر معیاری ہوتا تھا۔ ان کی چلت پھرت، توڑے اور ٹکڑے دیکھنے کے قابل ہوتے تھے جنے گھنگرڈ چاہتے بجاتے اور جس چیز کو چاہتے سو سودا غریب اداؤں اور، دلکش اشاروں میں بتاتے تھے نواب واجد علی شاہ کو ناچ گانے میں کمال حاصل تھا ان کا نام آتا تو اچھے اچھے کتھک اور گویئے اپنے کان پکڑ لیتے تھے۔ اسی طرح وہ زبردست کوئی بھی تھے اور لکھت بھی۔ خود رھس لکھتے تھے اور قیصر باغ میں جب وہ رھس کھیلنے جاتے تھے تو خود بدولت ہی ہمیر و کا پارٹ کرتے تھے۔ یہ رنگ دیکھ کر مشہور مشہور فن کار، کتھک اور رھس دھاڑیوں کی ٹولیاں لکھنؤ میں سمٹ آئی تھیں اور لکھنؤ بقول شمسہ راجہ اندر کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔

اس زمانے میں لکھنؤ میں نئے نئے رھس تیار ہوتے تھے جن میں دیو اور پریوں کے عاشقانہ قصوں کے خیالی پلاٹ بنا کر اداکاری کے ذریعہ دکھانے کی،

کوشش کی جا رہی تھی۔ امانت نے لوگوں کی بڑھتی ہوئی دلچسپیاں دیکھیں تو فوراً قلم اٹھایا اور ادھر ادھر سے پلاٹ لیکر ۱۲۰ء میں ایک جلسہ یا رقص تیار کیا۔ یہ گویا ہندوستانی زبان کا پہلا ڈراما تھا۔ یا یہ کہو کہ اردو ڈرامے کی داغ بیل تھی اب اس ڈرامے کو اسٹیج کرنے کی سوجھی۔ بھلا اداکاروں کی کیا کمی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک نیا کار اور اچھے سے اچھا اداکار آ موجود ہوا۔ رہا سلسلہ ہوئی اور بڑے انتظار کے بعد خدا خدا کر کے یہ ڈراما کھیلا گیا۔ اسٹیج ایک بڑے چبوترے کی طرح تھا۔ تین طرف سے بند اور سامنے ایک خوش رنگ پردہ تھا۔ یہ گویا ڈراما سینی تھا۔ اس پردے کے آگے تماشہ بین بیٹھے اور پیچھا داکار کیل کانٹے سے لیں ہو کر کھڑا رہتا تھا سب سے پہلے ایک صاحب تشریف لائے اور ضروری اعلان کر دیئے، پھر پردہ اٹھتا۔ پہلے اداکار جھک کر حاضرین کو کورنش پہلاتا اور اپنا تعارف کراتا۔ اس کے بعد طبلہ پر تھاپ پڑتی اور بین، 'تبسمورہ'، ستارہ سارنگی، رباب اور قانون سے طرح طرح کے نغمے نکلنے لگتے۔ محفل رقص و سرود گرم ہوتا اور دلکش تالوں اور ساز کی صداؤں سے فضا بگونج اٹھتی۔ اس کے بعد اداکار اپنا پارٹ شروع کرتا۔ ادھر پارٹ ختم ہوتا اور ادھر پردہ کھینچ دیا جاتا تھا

تماشہ دیکھنے کے لئے خلعت ٹوٹ پڑتی تھی۔ لوگوں کو یہ سمجھا اس قدر پسند آئی کہ چند روز تک وہ اپنے دھندے بھول گئے، گویوں کے بازار ٹھنڈے پڑ گئے اور نقالوں، بھانڈوں اور رقص دھارٹیوں کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے اور دماغ چکر اگئے۔ ہر شخص کے سر پر پر یو لہ کا سایہ اور اندر سمجھا کا دیو سوار تھا جسے دیکھو سیر بھی اور غلم پری کے راگ گاتا نظر آتا تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر یار لوگوں کے پیٹ میں چھبے دوڑے اندر سمجھا کی ٹکر پر لگھنے لگے نیا نیا سمجھیں بنان شروع کر دیں اور ہر شخص اپنی ایک نیا نیا کمپنی قائم کرنے کی دھن میں پڑ گیا کسی سمجھیں لکھی گئیں

مگر وہ سب کا سب سمجھائیں چند ہی روز میں غائب ہو گئیں۔ لیکن ان باتوں سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ عوام کو ناٹک دیکھنے کا شوق ہو گیا، لوگوں کو ڈراما لکھنے کا ذوق ہو گیا اور ناٹکوں کی بنیاد پڑنی شروع ہو گئی۔ لیکن دیکھا جائے، تو ہمارا ناٹک برابر قلا بازیاں پر قلا بازیاں کھا رہا ہے اور بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے ہٹتا چلا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ ابتدائی دور میں پاکیزہ اور قابل احترام ڈرامے لکھے گئے اور ان کی اداکاری میں عالم و فاضل لکھے پڑے اور اونچے طبقے کے لوگ حصہ لیتے رہے۔ اس کے بعد جو غوطہ کھایا تو دیو اور پریوں کے حسن و عشق کے قصوں پر اتر آیا اور اس کی اداکاری کیلئے بچے گریئے اور خاندانی رقصوں کی ضرورت پڑی۔ کچھ روز کے بعد دیو پریوں کے افسانوں اور خیالی قصوں سے لوگوں کی طبیعت اکتا گئی اور عوام کی دلچسپیاں گھٹنے لگیں تو پھر یاروں نے خود اپنے واقعات اور عشق و عاشقی کے ناٹک لکھنے شروع کر دیئے جس میں بے تکی شاعری، بازاری مذاق اور ادنیٰ قسم کا ناچ گانا تھا۔ یہ ناٹک لکھنے کیلئے پڑے کچھ لوگوں کی، ضرورت تھا نہ ہی ادنیٰ اداکاری کیلئے، تعلیم یافتہ آدمی کا حاجت

کچھ عرصے کے بعد آہستہ آہستہ جگہ جگہ سمجھائیں اور ناٹکیں قائم ہونی شروع ہو گئیں بہاری لال کی سمجھائیں لکھنؤ میں بے لیٹر کہنی، آگرہ اور علی گڑھ میں بھارت ویاکل کہنی، میرٹھ میں البرٹ تھیٹر بکل کہنی، پنجاب میں جمہور کہنی، امپریل کہنی اور خدا معلوم کون سی کہنیاں کھلیں جس کا مقصد ناٹک یا خدمت میں کوئی خوبی پیدا کرنا یا اصلاح کرنا نہیں تھا بلکہ محض تفریح نفس طبع اور وسیع کمانا تھا۔ پھر کیا تھا ڈراما نویس اور اداکار برساتے منیڈ کون کی طرح ابل پڑے جسے دیکھو ڈاڑھی مونچھے منڈائیئے، کانوں کی بوتلیں تھیں بنائے، سر کے بال بڑھائے اور ایکڑوں کی صورت بنائے ہوئے نظر آنے لگا۔ کچھ پڑے

اور شریف گھرانے کے لوگ تو اداکاری اور تھیٹر کی نوکری سے کوسوں دور بھاگتے
 تھے ہاں جاہل، آوارہ گرد اور ڈوم ڈھارڑیوں کیلئے یہ میدان کھلا ہوا تھا۔ ان میں
 اگر کوئی خوش رو اور خوش گلو رہا کے مل جاتے تو پھر تو پوہار سے تھے ورنہ یار لوگ
 ان کے منہ پر پوڈر تھوپ تھوپ کر اس کبھی کو پورا کر دیا کرتے تھے۔ یہ رٹا کے چند گاتے
 دربار وغیرہ میں مانا جتے اور حسب ضرورت چھوٹے موٹے زمانے پارٹ بھی کر دیا کرتے
 تھے۔ بڑی عمر کے لوگ عاشق، رقیب اور اسی قسم کے دوسرے پارٹ ادا کرتے
 اگر کسی ایکٹر کا شیخ کافی درست ہوتا یا کچھ لکھا پڑھا ہوتا تو پھر کیا کہتے ہیں وہ تو اندھوں
 میں کاناراجہ تھا۔ ورنہ جو ذرا ناچ گانا جانتا داڑھی، بانک، بوٹا، سب کچھ واقف
 ہوتا تو لبیں بہترین اداکار سمجھا جاتا تھا۔ جب تماشوں میں لڑائی کا سین آتا وہ ایک
 ایک کر تلوار کا پھینک جاتا تھا، جھگڑے، ٹپٹپے کے وقت لٹکھ چلاتا اور پیترے
 بدل بدل کر خوب ڈنڈے گھماتا تھا اور تماشوں میں بچوں کی طرح دیدے بھاڑے
 ہوئے اس کی چلت بھرت، غور سے دیکھتے تھے اور واہ واہ کے نعرے لگاتے
 رہتے تھے۔ بعض نو جوان جن کے خدو خال ٹھیک اور نکھ سکھ سے درست ہوتے
 اور مسکنا چمکنا جانتے انہیں ہیروئن اور اپنے قسم کے پارٹ دیئے جاتے یہ لوگ
 ڈاڑھی مونچھے منڈا کر کنگھی جوڑے سے لیس ہو کر بڑے ناز و خروش سے جھم جھم کرتے
 ہوئے اسٹیج پر آتے بعض کمپنیوں میں تو چیف ایکٹر اداکاری کے ساتھ ساتھ ڈراما نویس
 کے فرائض بھی انجام دے لیتا تھا۔ سچے پوچھو تو وہ ڈرامے کی دم بھی نہیں جانتا تھا
 پھر کیا کرتا تھا۔ مختلف زبانوں کے ڈرامے سامنے رکھ کر سین قائم کرتا اور تنگ
 بندی کرتا رہتا تھا۔ یا کسی قصے کی بھی گردن توڑ مردہ کراہی کیا قصہ گھڑ لیتا یا اس
 قصے کو الٹ پھر کر کے عبارت میں ڈھال کر باجاً موقع بہ موقع گانے ٹھونس دیتا
 تھا۔ لیکن یہ ڈراما تیار ہو گیا۔ مثلاً اس زمانے کے ایک مشہور ڈراما "سحر ساری جمشید"

کی مثال سنئے۔ اسے مرزا نظریگ نے لکھا ہے جو لاسٹ آف انڈیا کے اداکار تھے۔ اپنے
ڈرامے کے ذریعے میں فرماتے ہیں۔

”شاہنشاہ کا خدمت میں التماس کرتا ہے کہ میں نے یہ ناول ایک بہت
پرانی کتاب طلسمات سحر سامری سے لیا ہے اور اسی میں موقع موقع
سے چند سین پرنڈاق زیادہ ڈال کر گانے اور ڈرامے مقفی عبارت
میں بہت کوشش اور جانفشانی کے ساتھ بنایا کر شامل کیے ہیں“

یہ بھی جناب کی اسیکم اور یہ تھا جناب کے دیا چے کا خلاصہ اور یہی وہ ڈرامے تھے جو ناٹک
کئے جاتے تھے اسی کے دو چار نام بھی سن لیجئے۔ کنک تارا، ماہی گیر، خاندان شیطان،
ابوالحسن، یو این ناگ اور طلسمی تیلادیزہ۔ ڈرامے بہت تھے مگر وہ طباعت کے زیور سے
آراستہ ہو کر شاہنشاہ کے ہاتھوں کی نہ پہنچتے تھے بلکہ ڈراما نویس یا چیف ایکٹر وک
سینوں میں محفوظ رہتے تھے۔ اگر خدا نخواستہ وہ چھپ جاتے تو روز کا ٹھیکران کے
ہاتھ سے چھین جاتا اور پھر کوئی انھیں کوڑی کو بھی نہیں پوچھتا۔ مجھے ایک واقعہ یاد
آیا لگے ہاتھوں وہ بھی سن لیجئے۔ ایک جاگیردار صاحب کسی غشی جی سے نارسی پڑتے
تھے لیکن دم بخود کو ہمیشہ دم بخود کہتے تھے کسی نے کہا غشی جی ہیں جاگیردار صاحب
سے تو کہنے کی جرأت نہیں ہوتی آپ اس غلطی کی اصلاح کو کیجئے۔ غشی جی نے
کہا بھائی جاگیردار صاحب کی اپنی غلطی تو میری زندگی کا سہارا بنی ہوئی ہے اگر ان کی
اصلاح ہوگی تو پھر مجھے کون پوچھے گا۔ غرض یہ کہ دم بخود کہتے کہتے جاگیردار صاحب
کا دم بخود ہو گیا۔ اب آپ فرمائیے اگر وہ اپنا ڈراما چھپا دیتے تو چیف ایکٹر اور
غشی جی کی کس کو ضرورت رہتی۔

ایب ذرا مکالمہ یا بات چیت کی کیفیت بھی سن لیجئے۔ ڈرامہ معاملہ سے
لے کر جاہلی تک اور پچے سے لے کر بوڑھے تک مقفی عبارت و عبارت چیت ہو گئی ہے۔

مختبر فیلاں کے ساتھ ساتھ بعض اوقات شعروں میں بات چیت ہونے لگتی ہے جس پر معلوم ہوتا ہے کہ بیت بازی ہو رہی ہے۔ پھر گانا الگ ہوتا ہے۔ اس کا تو یہ کیفیت ہے کہ ملازم بھی گاتے ہیں، بیگم صاحب بھی گاتی ہیں۔ غصہ میں بھی گاتے ہیں۔ غم میں بھی گاتے ہیں۔ خلوت میں گاتے ہیں اور جلوت میں گاتے ہیں۔ شہزادی بھی گاتی ہے بادشاہ سلامت بھی گاتے ہیں۔ تزع کے حالات طاری ہے مگر گانا جاری ہے۔ بلکہ مرتے مرتے ددین گنگریاں اور تارینوں کے رسم پر دم توڑتے ہیں۔

آج کل ہم جو باہر کے ناٹک دیکھتے ہیں تو ان میں عام طور پر رنگے ہوئے پردے ہوتے ہیں تاکہ واقعات کا ہوا تصور پر کھینچی جائے ایکڑ بھی اس زمانے کا لباس پہنتے ہیں۔ پردے پر عاریتیں بھی اسی زمانے کا ہوتی ہیں جس زمانے کے واقعات اس ڈرامے میں بنائے گئے ہیں۔ پھر رنگ برنگی کا روشنی ایسٹج اور اداکاروں پر ڈالتے ہیں جن سے مختلف جذبات متحرک ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ہمارے پرانے ناٹکوں میں تو یہ کیفیت تھی کہ قصہ تو ایرانیوں کا ہوتا ہے اور اداکار یونانی لباس پہنا کر نکلتے ہیں۔ پاؤں میں پنجالی جوتے پہنتے اور پردوں پر ہندوستانی کے سین ہوتے ہیں۔ بادا آدم کے زمانے کا قصہ ہے اور پردہ پر تاج محل آگرہ بنا ہوا ہے، رستم پر موٹریا بھی چلی رہی ہیں اور بائسکلیں بھی چلی جا رہی ہیں۔ ایسٹج پر کٹسٹن لٹکتے رہتے تھے جو بعض اوقات تیل کی کھا اور ہوا کے جھونکوں سے کھینچ بکھڑکتے تھے اور گھبراہٹ میں ہوجاتے تھے۔ اداکار پسینے میں شرابور رہتا اور اس کے چہرے سے پوڈر اور روغن ہوتا رہتا تھا۔ کبھی تو اس کا چہرہ دکھائی دیتا اور کبھی چراغ گل اور پگڑی کا غائب کا معاملہ پیش آجاتا۔ مگر اندھیرا ہوا یا جالا وہ برابر گلا پھاڑ پھاڑ کر خیمیا رہتا اور ڈرامے کو زیادہ سے زیادہ بناوٹی اندھ معنوی بنا رہتا تھا۔ وہ ڈرامہ گرا اور ادھر چین ایکڑ صاحب تشریف لاتے اور کڑکی کڑماتے۔ دو ہفتہ شاہ قیسن! آج کا ڈرامہ بعد ایک ڈرامہ سین کے ختم کیا جائے۔

گا اور کل ہمارا مشہور و معروف ڈراما اندر سبھاٹے سین سینئر نے کی
ساتھ موزون برتن پوشاکوں کے آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔
جس میں چھین چھری، سبر پری، گینڈے خاں، لال دیو اور ہسار کا لال
بائے گلغا کا پارٹ انجام گئے۔ جس طرح آج آپ تشریف لاٹے
کل بھی تشریف لائے اور کچنی بڑا کو مشکور فرمائیے۔
لیجئے ادھر ان کا ڈراما ختم ہوا اور ادھر میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

اندر سبھا کے بعد

اندر سبھا اسٹیج ہونے کے بعد جیسوں سبھا میں نکھی گئیں اور
اسٹیج ہوئی جب ان سبھاؤں سے لوگوں کی دلچسپیاں بڑھنے لگیں تو اُسے بھاٹہ بھر پے
اور نعل لے اُڑے۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر چکر لگاتے، جہاں موقع پاتے راجہ
اندر کا اکھاڑا جمادیتے اور کھیلے میدان میں ہال دیو، گلغام اور پیروں کو اتار کر تماشے
دکھاتے اور خوب روپیہ کھاتے پھرتے تھے۔ یہ تماشہ دیکھ کر بعض رنگین مزاج لوگوں
کے منہ میں پانی بھر آتا۔ انھوں نے بھی ادھر ادھر سے روپیہ بھرا اور اپنی اپنی
سٹولیاں بنا کر ان ہی ڈوم ڈھار پیروں کو اپنی کمپنی میں نوکر رکھ لیا۔ وہ ایک گاڑی سے
دوسرے گاڑی اور ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں گشت کرنے گئے۔ جہاں موقع پاتے
وہیں اپنے ڈیرے ڈال دیتے اور بستی سے ذرا فاصلے پر کوٹا اچھا مقام دیکھ کر زمین

کو پھوڑا کرتے اُس کے بعد ہی ایک لمبا چوڑا گڑھا کھودتے اور اُس گڑھے کا مٹی کو
 دھوپ والے حصے میں ڈال دیتے۔ اب اس ہموار میدان کو اسٹیج بنا کر ڈراما کھیلنے
 قریب اور سکند کلاس والوں کو گڑھے میں ڈال دیتے اور اُن کے سر پر لیٹی ادبے
 تمام تھوڑا کلاس قائم کرتے جس درجہ کے لوگ چونے والا کس نام سے مشہور ہیں ان کے
 پاس دس پانچ پردے بھی ہوتے ہیں پر رنگ خوب کر لئے یہ دھڑکیں بناتے
 تھے جن میں نہ تو پرسپیکٹو ہوتا تھا اور نہ کوئی گھڑا سیکم لیب اندر سجھا ہوا بیٹھا زہر
 پھر عشق ہوا عشق پیمپاں، ان تمام تماشوں کو بس اُن ہی گنتی کے پردوں پر کھینچتے
 رہتے تھے۔ پھر تماشا جتنا لمبا ہوتا دیکھنے والے اتنے ہی زیادہ خوش ہوتے تھے اور
 اس کھیل کا تعریف کرتے تھے آج سے چالیس چاس سال پہلے میں بھی اس قسم کے
 ایک ناٹک میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اندر سجھا ہوا رہی ہے۔ گلفام تو خیر گلفام ہی
 تھا مگر جنر پری کے چہرے پر کھوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ کوئی ساڑھے،
 نو بجے تماشا شروع ہوا۔ جھولے پر بٹھا کر پریاں اتاری گئیں، وہ خوب
 لگاؤ میں، خوب ناچیں، گلفام اگلا بھاڑ بھاڑ کر چنچا، لال دیو اور کالے دیو نے منہ سے
 رال کے شعلے اڑائے اور ٹھٹھک ٹھٹھک کر خوب بھاڑ تباہے۔ اللہ اللہ کر کے
 تماشا ختم ہوا اور جب میں گھر پہنچا تو اُس وقت مرغ اذان دے رہے تھے۔ جس
 زمانے میں ہمارے ہاں یہ گائی کھل رہے تھے اس زمانے میں کلکتہ اور بمبئی جیسے
 بڑے بڑے شہروں میں انگریزوں کا تفریح کیلئے سرکس تھیٹر اور آہرا بھی
 ہوتے تھے جہاں آرکسٹرا کے آرٹسٹ باضابطہ ڈریس پہنے، ہاتھوں میں آلات
 موسیقی لیے رہنے کمال دکھاتے اور جانفزا فلموں سے فضاء کو خوشگوار بناتے
 رہتے تھے اُن کے اسٹیج کار کھار کھاؤ نشست کے انتظام بہ دے، لباس اور،
 اداکاروں کے میک اپ دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھلیں پارس، تعلیم یافتہ اور

شوقین تھے۔ لندن اور پیرس سب ہی آتے جاتے رہتے تھے۔ پھر تجارتی معاملاتی
 میں ان کی طبیعت کو فطری لگاؤ تھا۔ یورپین ٹھیکرڈوں کو دیکھ کر انہیں بھی جدید
 قسم کے ٹائیک بنا نے کی سوچھی۔ پھر کیا تھا فوراً اسلیم تیار کر گئے اور سب سے پہلے لپٹن
 جی فرام جی نے اور پھیل ٹھیکریکل کمپنی کے نام سے بمبئی میں ایک ٹائیک کمپنی کھول دی۔
 لپٹن جی فرام جی کو ٹائیک وغیرہ کے کاموں سے بید دلچسپی تھی۔ ان میں انتظامی
 قابلیت تھی وہ شاعر بھی تھے ڈرامہ بھی لکھ لیتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ
 ایک اچھے اداکار بھی تھے مگر انھوں نے اوروں کی طرح اپنی کمپنی کیلئے خود ڈرامہ
 لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی بلکہ اس کام کیلئے ہندوستان کے بہترین انشا پردازوں
 کی خدمات حاصل کیں۔ ان میں ایک تو رونق بنارس ہی تھے اور دوسرے حیاں ظریف
 ظریف کے کیا کہنے میں وہ تو ڈرامے کی مشین تھے۔ ادھر فرمائش کا اور ادھر ڈرامہ تیار
 دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے کولمبیا چالیں ڈرامے دھر گھیسے علی بابا،
 گل بکا ڈلی، نیرنگ عشق، چترا بکا دل اور عاتق طلال جو نام ہم سب سے چلے آ رہے
 ہیں وہ ان ہی کا خام فرسالی کا نتیجہ ہیں۔ پھر قسمت دیکھئے ان کی کمپنی کو اداکار بھی
 ایسے ملے جو اپنا جواب آپ تھے۔ ان میں سے سید اور ان کے تئیسوں بھائی بالی والا
 اور کھٹاڈ کے نام تو اب تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔

اور پھیل ٹھیکریکل کمپنی لپٹن جی فرام جی کی زندگی تک تو خوب چلی اُن کے
 بعد تو کمپنیوں پر کمپنیاں کھلتا شروع ہو گئیں۔ یہ تمام ٹائیک اور کمپنیاں انگریز
 مذاق کے مطابق بنائی گئی تھیں ان سب نے مل کر قدیم ٹائیکوں کا گلا گھونٹ دیا۔
 اب کیا تھا انگریزی وضع کے نفیے بازاروں میں چل پڑے ناچ کے بدلے یورپ
 کی ڈرل شروع ہو گئی، جس میں لڑکے رنگ رنگ کا پوشاکیں پہنے کبھی اسٹیج پر
 اُچھلتے، کبھی کودتے، کبھی تلا بازیاں کھاتے اور کبھی ایک دوسرے کے کاغذ

پروچسٹڈھ کر سرکس شروع کر دیتے تھے۔ پارسسی تھیٹر دن کے اوقات، ترتیباً طلسم
عالمی اور زرق برق پر دولہے لوگوں کی آنکھوں میں چکا چوندا پیدا کردی۔ اور ہماری
وہ بڑا لانا ایکٹنگ اور قدیم ناچ گانا سب ہوا ہو گیا۔

پسٹی جی فرام جی کے مرنے کے بعد بالی دالے نے دکتوریہ تھیٹر لیکی کمپنی کے
نام سے اپنی ایک کمپنی الگ قائم کر لی۔ اس میں عورتیں بھی تھیں۔ جس میں مس زہرا مس
خورشید اور ایک میم صاحب مس میری چٹن کے نام سے مشہور تھیں۔ انھیں انگریزی
پریڈ اور ڈرل کے علاوہ ہندوستانی ناچ گانے میں بھی کمال حاصل تھا۔ ان سب ناٹک
کے ستاروں نے اپنی چمک دمک اور چمک ٹمک سے کمپنی میں چار چاند لگا دیئے تھے
اور ناٹک کی دنیا میں ہل چل سی پیدا دی تھی۔

طالب نیارسی اس کمپنی کے ڈرامہ نویس تھے۔ جس میں طرافت کوٹ کوٹ کر
بھری ہوئی تھی۔ ان کا ہر جملہ طرافت کی پھل پھری ہوتا تھا انھوں نے کوئی دس بارہ
ڈرامے لکھے اور وہ ہر ڈرامہ میں اپنے سٹیج بالادالے کے مذاق کے لحاظ سے کامک
پرائیڈی چوٹی کا زور لگا دیتے تھے۔ بالادالا بہترین کامک ایکٹر تھا طرافت اس کے قدم
چومتی تھی۔ ادھر فقرہ اس کا زبان سے نکلا اور ادھر لوگ ہنس پڑے اور ادھر
فقرہ ختم ہوا اور یار لوگ لوٹن کبوتر ہو گئے سٹیجوں، تہقوں اور تالیوں سے
تھیٹر گونج اٹھتا تھا۔ مختصر یہ کہ اس کمپنی نے وہ زور باندھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے
اٹک سے لے کر کلکتہ کی مشہور ہو گئی سٹیج کے قیصری دربار کے موقع پر جب
کمپنی دلی آئی تو اس پر یار لوگ ایسے لٹو ہوئے کہ اپنے سب کام دھندے بھول
گئے، مشہور رہے کہ سٹیجوں نے اپنے بیل اور شکیں بیچ دیں، دروڑی اور دھوبیوں نے
کپڑے اور لوگوں نے زیور گدی رکھ کر اس کے تلاشے دیکھے۔

چند سال بعد سٹیج میں لندن میں کرشیل پلیٹ کی نمائش ہو رہی تھی۔

ہندوستان سے عجائب روزگار سامان ماہرین اور فنکار جا رہے تھے۔ بالی دالے کو بھی یورپ جانے کا سوچھی وہ بھی مع اپنے ساز و سامان اور ایکڑوں کے لہذا جا، پہونچا اور مشرقی رنگ میں ڈوبا ہوئی ایکٹنگ اور ہندوستانی ناپچ گلنے کے پر دگراں پیش کیئے جو لوگوں کو بہت پسند آئے پھر شاہی دربار میں بھی جا پہونچا۔ ملکہ وکٹوریہ ایڈورڈ ہفتم نے بھی ان کا پر دگراں ملاحظہ فرمایا۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی، خوشنودی کے فرمان جاری ہوئے اخباروں میں تصویروں چھپیں اور تھے سرفراز فرمائے گئے اس سفر سے انہیں رتھی نایہ ہوا ہویا نہ ہوا ہو مگر اتنی بات ضرور ہے کہ انہوں نے وہاں کے تھیٹروں کو دیکھا ایسے کے رکھ رکھاؤ دیکھے اداکاروں کے رنگ ڈھنگ دیکھے اور آتے وقت جو کاٹ کباڑ یہاں سے لے گئے تھے اسے وہیں غرق مئے ناب اولیٰ کہہ کر دریاے تھیمس میں ڈبایا اور نئے ساز و سامان اور فنی معلومات کا قیمتی ذخیرہ اپنے ساتھ لے آئے۔

ادھر کاؤس جی کھٹاؤ نے اپنی ایک کمپنی الغریڈ تھیٹر لیکل کمپنی کے نام سے الگ قائم کر لہ کھٹاؤ کے متعلق میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ وہ بے مثلی سٹریک ایکٹر تھا اور دلولہ انیگنر جذبات کا تر جانی اس جوش و خروش سے کہتا تھا کہ لوگ دنگ رہ جاتے تھے جیسا وہ ایسٹ پر آتا تو پبلک اس طرح بہوت ہو جاتی کہ گویا سانپ سونگھ گیا ہے ہاتھوں کے حرکات چہرے کے جذبات آنکھوں کے اشارے اور آواز کا اتار چڑھاؤ، جذبات کے جذر و مد کو اُبھارتا، رہتا تھا۔ اُسے اپنا آواز اور ایکٹنگ پر ناز تھا جب کڑک کر بولتا تو معلوم ہوتا کہ ترم بج رہا ہے۔ ایہ بھی خوشگوار تھا اور آواز بھی دلکش اور پنی تلی جو قبول شمعہ درجہ خاص سے لیکر چوٹی والوں کے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی رہتی تھی اور سب کو مرعوب کرتی رہتی تھی۔

جب وہ رومیو اور ہیلٹ کا پارٹ کرتا تو سر غیری اردنگ کا یاد تازہ کر دیتا تھا۔ اسی مناسبت سے لوگوں نے اُسے ہندوستان کے اردنگ کا خطاب دے دیا تھا۔ کاؤس جس کے علاوہ دوسرے اور اداکار بھی مجھے ہوئے اور بحر بہ کار تھے ماسٹر موہن، منچر شاہ اور گلزار خان وغیرہ جب اسٹیج پر کتے تو قیامت ڈھلاتے مس زہرہ اور گوہر کا کیا پوچھنا ہے ان کا اداکاری پر تو ہر شخص لٹوٹا تھا۔ ہر طرف اُن کا طوطی بول رہا تھا۔ دکانوں پر تصویریں لگی رہتی اور دیواروں پر نام لکھے رہتے تھے۔

تھیٹر کیل کمپنی کے مشہور ڈرامہ شہید ناز گلنارا فیروزہ ادلفردش اور بھولی بھلیاں تھے جن میں احسن لکھنوی نے شیکسپیر کے ڈراموں سے پہلی مرتبہ اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ احسن کے بعد پنڈت نرائن پرشاد بقیاب آئے پنڈت جی بڑے ودوان ہندی سنسکرت اور اردو فارسی کے ادیب تھے اُنھوں نے جہا بھارت کرشن سدا ما، رامائن اور کئی اور ہندی ڈرامہ لکھے جو بڑی دلچسپی سے دیکھے گئے زہری سانپ بھی ان کا ہی لکھا ہوا ہے اور دہلی کا مشہور واقعہ نظر جان کا قتل جس کے گیت دہلی میں اب تک گائے جاتے ہیں۔

کلمتہ سے چلی نظر جان۔ چلی قریب لیا اُس نے مکان اس واقعہ کو سب سے پہلے پنڈت جی نے ڈرامہ کی شکل میں لکھا اور جب وہ ڈرامہ قتل نظر کے نام سے کھیلا گیا تو دیکھنے کیلئے خلقت ٹوٹ پڑی۔ بقیاب کے بعد آغا حشر کاشمیری آئے۔ ان کے کیا کہنے ہیں جب تک اسٹیج کی دنیا چالو ہے اُن کا نام بھی برابر چالو رہے گا۔ آغا صاحب ضربی شاعر، مقرر، ادیب اور ڈرامہ نگار ہی نہیں تھے بلکہ زبردست اداکار اور ناٹکوں کے کاروبار کے بڑے جانکار بھی تھے اُنھوں نے کوئی چالیس، پچاس ڈرامے لکھے اور جو ڈرامہ لکھا وہ شہرت کے آسمان پر آفتاب

بن کر چمکا۔ ان کے آگے بڑے بڑے کلاکار اور ڈرامہ نویس ماند پڑ گئے بلکہ یوں کہو کر نعلیں جھانکنے لگے۔ لوگوں میں ادباً ذوق اور اُردو ڈراموں کا شوق پیدا ہو گیا۔ ان کے بعض ڈرامے تو خالص ہندی میں جیسے سُر داس، بن دیوی، گنگا ترن اور ستیا بھاس وغیرہ اور بعض ٹھٹھہ اُردو میں جیسے ایسر جی، خواب ہستی، خوب صورت بلا، سلوک کنگ اور عورت کا چار، آغا صاحب کو شیکسپیر کے ڈراموں سے بے حد دلچسپی تھی اور انھوں نے شیکسپیر کے اتنے ڈرامے ترجمہ کیے کہ وہ ہندوستان کے شیکسپیر شہور ہو گئے۔ اُس کے بعد جو انھیں جوش آیا تو انگریز کمپنی کو چھوڑ خود اپنی ایک کمپنی شیکسپیر تھیٹر لیکل کمپنی کے نام سے الگ کھول لی۔ وہ چلی اچھ خوب چلی مگر بعض اسباب ایسے آ پڑے کہ آغا صاحب نے اس کو ختم کر دیا۔

۱۹۱۴ء میں کاؤس جی کا انتقال ہوا اور اس کے بعد اس کمپنی کو میڈن نے خرید لیا تو پھر آغا صاحب نے میڈن تھیٹر کو اپنی طبع موزوں کا جولان گاہ بنایا۔ نئے نئے ڈرامے لکھے۔ نئے نئے ڈھنگ سے انھیں ایڈج کیا اور نئے نئے سین سینیریز سے انھیں آراستہ و پیراستہ کیا۔

ہاں میں نے پارس تھیٹروں کے بہ دوں کا تو ذکر کیا ہی نہیں۔ آج سے کوئی تیس سال پہلے میں کلکتہ میں تھا اور ہر اتوار کو دن شا جی کے پاس جاتا تھا۔ یہ میڈن تھیٹر کے آرٹسٹ تھے۔ بڑے فنکار، ہوشیار اور تجربہ کار تھے وہ ہمیشہ نظر بندی کے چکر میں پڑے رہتے تھے۔ مجھے ایک چمک دکھائی دیتا تھا۔ پرائمری کلر میں تھا جس میں زرد رنگ نمایاں تھا۔ یہ موسم خزاں کا ایک سین تھا خزاں کا دور دورہ تھا، درختوں کی زرد شاخیں پس منظر میں پہاڑ تھے جس پر خزاں رسیدہ مڑھلتے ہوئے درخت سر جھکائے کھڑے تھے چاروں طرف خاک اُڑ رہی تھی اور درختوں کے پتے جھڑ جھڑ کر زمین پر گر رہے تھے۔ اس کے بعد بابا جی نے اسی

ہر جے پر گہری آسمانی روشنی ڈالی تو پردہ کا رنگ ہی بدل گیا موسم خزاں سے بہار ہو گیا۔ نازی رنگوں میں نئے نئے شید پیدا ہو گئے۔ زرد رنگی کے پاریاں سرسبز و شاداب دادیاں بن گئیں پلے پلے تھے سبز ہو گئے جہاں خاک اڑ رہی تھی وہاں ہریا جاری ہو گئیں اور رنگوں کا ہم آہنگی اور میل سے موسم بہار کا ایک خوشگوار اور شاداب منظر پیدا ہو گیا۔ اسی طرح کے کئی ایسے منظر بنائے تھے گنیش ختم ہو گیا ہی مقام پر پیدا لیں لڑکیوں اور جوانی کا منظر جنگلوں میں دریا بہتا مسلوں میں فواروں کا چھٹنا روح کا ایلیج پر آنا اور جسم شفاف دکھائی دینا۔ ایک سین کھود سوسین میں داخل اور تبدیلی غرض یہ کہ سین سنرینز سے شجہہ بازی اور معصوری سے نظر بند پر اتر آئے تھے۔

اس کے بعد الفرڈ کمپنی کے توڑ پر نیو الفرڈ کمپنی قائم ہوئی اس میں بھی آغا صاحب نے اپنا زور قلم بتایا۔ اسی زمانے میں بولتی فلموں کی صدائیں کانوں میں آنی شروع ہوئیں۔ بھلا آغا صاحب کہاں جو کئے والے تھے آستین چڑھا کر اس میدان میں بھی اتر آئے۔ کئی ڈرامے لکھے اور فلماٹے مگر عمر نے وفات کا اور ۱۹۳۴ء میں اپنا پارٹ ختم کر کے اس دنیا کے ایلیج سے چلے گئے اور ان کے مرنے سے اردو ادب کا ایک پہلو چوٹ ہو گیا۔ کسی نے تاریخ لکھی ہے

جب نہ نعم البدل ملا تو کھسا
حشر کی موت اک قیامت ہے

(۱۳۴۱ء بمطابق ۱۹۳۴ء)

اعتراف

آج سے تقریباً تین سال قبل کی بات ہے جب کہ حیدر آباد کے بعض دانشوروں
 معتمدوں اور صحافیوں نے مرزا عصمت اللہ بیگ کی ادبی اور علمی خدمات کو قدر و قیمت
 پیش کرنے کی غرض سے ایک یادگار و ادبی جلسہ یوم عصمت اللہ بیگ کا کامیاب
 اہتمام کیا تھا جس کا افتتاح اس وقت کے وزیر تعلیمات شری گوپال راجہ کی طرف
 سے فرمایا تھا اور شری بی ہمنٹ راؤ نائب وزیر مال جو دکنی گاندھی کے لقب سے
 مشہور تھے اس جلسہ کی صدارت فرمائی تھی اس جلسہ میں پروفیسر عبدالقادر ریکی
 رائے جانشی پر مشاد نائب ناظم اطلاعات شری فضل الرحمن ناظم تعلیمات اور
 پروفیسر علی الرحمن نے بڑے ہادیپ اور معلوماتی مضامین پڑھے تھے اس یادگار و علمی جلسہ
 کے کامیاب ترین انعقاد پر دینا نے اردو کے ممتاز اخبار روزنامہ سیاست نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۵ء
 کی اشاعت میں ایک دانشورانہ ادارہ سپر ڈھم کیا تھا جس کو میں یہاں ذیل میں نقل کیا جا رہا
 ہے جس کے لئے ہم ادارہ روزنامہ سیاست کے منگوا رہے ہیں کہ ہمارے کئی انصاف پسند
 کی نہ صرف حوصلہ افزائی ہوئی ہے بلکہ عصمت اللہ بیگ کی ادبی اور علمی خدمات کو اس ادارہ
 کے ذریعہ خاندان شالی پیر میں مزاج عقیدت پر پیش کیا ہے جو ناقابل خرافہ اور قابل
 ستائش ہے۔ مرزا عصمت اللہ بیگ مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے پر ہمارے ایک جلسہ منعقد ہو۔
 یوم عصمت اللہ بیگ اگر حیدر آباد کے کچھ بڑے علمی اور علمی حلقوں میں پیدا ہوتے تو یقیناً انہیں صف اول
 کا طرز پر مزاج نگار قرار دیا جاتا لیکن وہ حیدر آباد کی شہری ہو گئے تھے اور حیدر آباد کے بہتر مال بھی ہیشہ میں نظر میں رہے ہیں
 وہ یہ کہ عصمت اللہ بیگ کو وہ مقام حاصل نہ ہوا جس کے وہ مستحق ہیں۔ عصمت اللہ بیگ نے جو کچھ لکھا ہے، بلا شمار و مادی میں
 پیش کیا افسوس ہے کہ یہ کچھ بڑے ہیں کراچی کو رہنما ہیں خیر احمد مدنی کنیا مال پیر اور عصمت اللہ بیگ ہی دو ادیب ہیں
 ہیں جو صف اول میں ہیں۔ اب عصمت اللہ بیگ ہائی نہیں رہے۔ عصمت اللہ بیگ کو خراج عقیدت پیش کرنے میں یہ خطا
 شری ایکوٹے اور نائب وزیر مال شری ہمنٹ راؤ نے بھی حصہ لیا ہم ان دونوں وزراء کی اس جلسہ میں شرکت کو اہمیت دیتے ہیں
 چونکہ اردو کے ایک قضاویہ کی خدمات کے اعتراف میں وہ بھی عام کے ہوتار ہے اور ان کے شاعر و ادیب کے غیر مطبوعہ
 تصانیف کو شائع کرانے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس جلسہ میں یہ شرکت حیدر آباد کی روایات کے عین مطابق بھی ہے
 اس جلسہ کے ساتھ یہ خیال آتا ہے کہ آئندہ ڈھانچے میں ایسی رواداری کے مظاہر آئے دیکھنے میں آئیں گے۔
 اس یادگار و علمی جلسہ میں شری فضل الرحمن نے مرزا عصمت اللہ بیگ کے عنوان سے بڑا ہی دلچسپ تعارفی مضمون پڑھا تھا
 جو اس کتاب میں اولین صفحات میں شامل کیا گیا ہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ
 معتمد، عصمت میموریل پبلیکیشنز کمپنی

حکیم معشوق علی خاں جوہر

حکیم معشوق علی خاں جوہر کو بھارت میں اکثر لوگ جانتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ہر نامہ کوئی انھیں حکیم معشوق علی خاں کہتا ہے۔ کوئی معشوق علی صاحب کوئی دیکھل اور کوئی حافظ معشوق علی خاں جوہر اگر ان کے تمام القاب وغیرہ کو ایک جگہ جمع کر کے کسی سے پوچھا جائے کہ آپ حافظ حکیم مولوی معشوق علی خاں صاحب جوہر کامل طبیب و جراحات، منشی عالم مولوی فاضل، دیکھل درجہ اول عدالت العالیہ، سابق ناظم ضلع پانچونچہ شہزاد حضرت غالب دہلوی کو جانتے ہیں تو یقیناً ملتے کہ ہزاروں میں ایک بھی ایسا نہ نکلے گا جو گردن ہلا کر کہے کہ ہاں میں اُن کو جانتا ہوں۔

مثلاً مشہور ہے کہ چلتی کا نام گاڑی۔ جب تک حکیم جی کا سانس چلتا رہا اسی کا کوئی کام نہ رہا حکمت بھی چلی، شاعری بھی چلی، زبان بھی چلی لڑائی بھی چلی اور آخر میں وہ خود بھی اس دنیا سے چل بیسے۔ لیکن مجھ سے پوچھو تو حکمتان کے تحریر اور تشنیں سے شاعری طبع موزوں اور جوہر قابلیت سے لڑائی، تنگ مزاجی سے اور دکالت اُس دیکھل مطلق کی دکالت اور اللہ کے نام کی برکت سے اُن کے چلتے دم تک چلتی رہی مگر مجھے نہ تو اُن کی حکمت سے واسطہ اور نہ ان کی دکالت سے تعلق رہا اُن کا شاعری کے متعلق تھوڑا بہت جانتا ہوں وہ بیان کیے دیتا ہوں لیکن سنا سنایا نہیں جو نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جو ان کی باتیں اپنے کانوں سے سُنیں بس اس

کا ایک اٹھنڈا سا خاکہ - کھنچ کر پیش کر دیں گا۔

حکیم جی ۱۸۵۲ء میں شاہ پھول پور میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تعلیم پائی۔
 لکھنؤ میں طب کا نام روشن کیا؟ بھوپال میں شعر و سخن کی محفلوں کو گرمایا اور
 میدانِ سخن میں سمند فصاحت کو دوڑا یا حیدر آباد میں مدتوں دکالت کی اور آخر
 میں پھر پھر اگر جس قطع زمین میں پیدا ہوئے وہیں پیوند خاک ہوئے مگر
 عجیب بات یہ ہے کہ مرنے سے دو تہے پہلے اپنا مادہ تارخ کی نفسِ ذائقہ
 الموت کہا اور مئی ۱۹۳۸ء میں پورے چتر سال گزار کر اس شو و سخن
 کی دنیا سے نکلے اور استعارے اور تشبیہ کی دنیا میں جا بسے۔

حکیم جی کا قد لا بہا، بدن چھریرا، گھنڈی رنگ، ستوان ناک، غلامانی
 آنکھیں، چوڑا دبانہ، پتلی گردن اور کشادہ پیشانی تھی۔ سر کے بال بڑے تھے
 مگر آخر زمانے میں کچھ تو حجام کی تراش خراش اور کچھ خود ان کی بے رخی سے ہڈ کا
 تاج بن کر رہ گئے تھے۔ دائرہ لائینی اور گھنی تھی غور سے دیکھنے پر ایک ایک
 بال میں تین تین اور چار چار رنگ معلوم ہوتے تھے مگر دُور سے دیکھنے پر بس یہ
 معلوم ہوتا تھا کہ چہرے کے گرد قوسی قزح نکلی ہوئی ہے اس کی بڑی وجہ
 یہ تھی کہ حکیم جی دسوں بار خضاب لگاتے تھے مگر ساتھ ہی کسی ایک خضاب
 کے پابند نہیں تھے۔ ہر چہ آئید در گھٹ کے اصول پر چلتے تھے کبھی ہندی، کبھی
 دسم، کبھی چاند تارا، کبھی چرخ مارکہ کبھی کراون مارک اور کبھی ایجا دنڈ
 اگرچہ گندہ خاک یا برازہ گندہ ظاہر ہے کہ ایک خضاب کا دوسرے پر کیوں رنگ
 جمنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک ہفتہ بعد ذرا دائرہ لائینی بڑی تو اس کے شروع
 حصے کا دور ایک سپید جھال کا طرح رنگ چاہوا معلوم ہونے لگا اس سے
 ملا ہوا بھورا، پھر کالا، پھر سرخ اور پھر آخر میں سرفی مائیلی مگر دائرہ لائینی پر
 ہندی کا رنگ بقیہ رنگوں کو دبا لیتا تھا کان کے بال توجہ اور سماعت کا تیغی اور

جاتے اور چہرے کی جھڑیاں خندہ پیشانی اور خندہ رملہ کو بھی نمایاں کرتی
 رہتی تھیں ہنہ میں ڈارھوں اور کوچیلوں کے علاوہ دکھانے کے آثار نہ تھے
 جس کا پتا دور اور نزدیک سے یکساں چلتا رہتا اس لیے کہ دانتوں کی نمایاں اس
 قدر ڈھیلی پڑھ گئی تھیں کہ ادھر ہنہ کھلا اور اوپر کا چوکا نیچے کے چوکے پر کھٹ
 سے گرا اور باتیں کرتے وقت اس طرح کھٹا کھٹ ہوتا تھی کہ گویا ٹیلی گراف کے
 آلے یا ہارمونیم کے پردوں پر کوئی انگلیاں مار رہا ہے۔

جب بھی اگلی صحبتوں کا ذکر کے یا کسی کا کلام سنتے تو سیدھا ہاتھ
 اپنے زانوں پر بٹھا بیٹھ مارتے دانتوں سے کھٹا کھٹ آواز آتی ہونٹوں
 سے چٹا چٹ صدا میں نکلتی اور زبان قہقی کہ طرح چلتے رہتی دوران گفتگو میں
 نیستے الفاظ چٹ اور برجستہ فقرے تشبہ اور استعارات میں ڈوبے ہوئے
 رنگیں چلے اس طرح بے تکان بولتے چلے جاتے ہیں۔ کہ سن کر دل میں فرحت اور
 روح میں تازگی پیدا ہوتی رہتی۔ بیاں کہ شیرینی کا یہ عالم کہ مشکل سے مشکل چیز
 کو سمجھاتے تو سننے والوں کو معلوم ہوتا کہ ایک شربت کا گھونٹ ہے جو خلق سے

اُترتا چلا جا رہا ہے ان کی تلمذ میں بحر قلم دوات اور دو چار سادے کاغذوں
 کے کوٹ ڈوسرا علمی خزانہ نہ تھا مگر حافظہ وہ بلا کا کہ اُردو فارسی کے ہزار ہا
 شعر سیکڑوں برجستہ چلے جیسوں لطیفے اور علمی نکات حتیٰ کہ تاریخ و ارتاری
 واقعات، شعراء، ادباء اور حکماء کے سوانح حیات اور بے حساب طبی
 چٹکے اور نسیم جات معہ حواشی اور حوالیات نو کیا زبان پر کھیلے رہتے تھے۔

ادھر کسی نے ابھار شعر پڑھا ادھر حکیم جی نے اپنے زانوں پر ہاتھ
 مارا ہونٹ دبا کر چٹا چٹا اور کھٹ سے پوری غزل معہ اس کی شان نزول
 کے دُپڑا گئے، پھر اسی رد میں نامور شعر کی طبع آزمایاں اور سب سے آخر میں
 اُن کا فیم اور ردیف میں خود بھی دو چار شعر فی البدیہ کہہ کر شمشیر نکر کے

جو ہر دکھا جانتے غالب مرحوم کی شاگردی اور علماء کی فیض صحبت نے انھیں استادان سخن کے گردہ میں لا بیٹھا یا تھا جو دیباچے نگر میں غوطہ مار کر دامن مقصود گوہر مراد سے پھر لاتے ہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حکیم جی کے پاس ایک پیر جی آیا کرتے تھے حکیم جی ازراہ مذاق اُن سے کہنے لگے بھی دیتا میں تین قسم کے پیر ہوتے ہیں۔ پیر پتھر، پیر پتا اور پیر لکڑی پیر پتھر تو وہ کہ خود بھی ڈوبے اور اپنے مریدوں کو بھی ڈوبے پیر پتا وہ کہ خود تو تیرتا رہے مگر اپنے مریدوں کو ڈوبادے اور پیر لکڑی وہ کہ خود بھی تیرے، مریدوں کو بھی تیراے ڈوبوں کو اپنی پیٹھ پر بیٹھا کر ساحل مراد پر پہنچا دیتے۔

بعض کہتے ہیں کہ غزل لکھنا آسان ہے اور قصیدہ کہنا مشکل ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں قصیدہ لکھنا آسان ہے اور غزل کہنا مشکل ہے وہ کہتے ہیں کہ غزل گو مضمون پر قلم نہیں اٹھاتا بلکہ ردیف اور قافیہ سے مضمون پیدا کرتا ہے اور قصیدہ گو مضمون کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور قافیہ اور ردیف کو مضمون کا تالیف بناتا ہے۔ مگر ہمارے حکیم جی کا قلعی فیصلہ ہے کہ جو لکھنا جانتے ہیں اُن کیلئے دونوں آسان ہیں جو نہیں جانتے اُن کیلئے دونوں مشکل ہیں۔ غزل پر اصلاح دیتے وقت کہتے تھے کہ اضاف سخن میں سب سے آسان یہی ہے مبتدی اپنی شاعری کی بسم اللہ سب سے پہلے غزل سے ہی کرتا ہے۔ اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک شعر کا دوسرے شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ایک میں بت پرستی ہے تو دوسرے میں توحید پرستی مسیحا میں شہے تسبیح پھیر رہے ہیں تو ابھی مندر میں بیٹھے مالا جب رہے ہیں پھر پھولوں کی سیجوں پر لیٹے شب وصل کے مزے لوٹ رہے ہیں تو کہیں شب سحر میں کانٹوں پر پڑے لوٹ رہے ہیں اب ایک خیال کو دو مہر عوں میں سمو دیتا ہے مگر اس کو بھی یار لوگوں نے الٹ دیا ہے پہلے تو قافیہ

ٹوٹتے ہیں پھر اس قافیہ کی مناسبت سے اخیر کا مصرع پہلے موزوں کرتے ہیں۔ اب رہا مصرع اول تو اسے آخر میں کہا کرتے ہیں مثلاً غزل میں غریب دیار قافیہ ہے اور ہم بھی ہیں ردیف ہے۔ اب آدھے سے زیادہ مصرع تو یوں ہی موزوں ہو گیا۔ غریب الدیار ہم بھی ہیں اب پورا مصرع موزوں کرنے میں صرف دو تین لفظوں کی کسر ہے۔ وہ بھی کہہ ڈالو۔ مثلاً اسی طرح سے غریب الدیار ہم بھی ہیں۔ یا تمہاری طرح غریب الدیار ہم بھی ہیں یکہ پاشکتہ غریب الدیار ہم بھی ہیں۔ اب رہا پہلا مصرع تو دوسرے کچھ ہوئے مصرع کی لفظی مناسبت یا مضمون میں ربط قائم کر کے آخر میں کہہ ڈالو۔ مثلاً فلک پر رہتے ہیں جس طرح نجم شمس و قمر یہ اسی طرح سے غریب الدیار ہم بھی ہیں رہے خیال ہمارا بھی تاملے والو یہ کہ پاشکتہ غریب الدیار ہم بھی ہیں یا تمہاری طرح غریب الدیار ہم بھی ہیں

جب قصیدہ لکھتے تو کہتے ہیں کہ بیٹا قصیدہ کہنا نہایت آسان ہے اس میں بندھنے کے الفاظ ہیں اور لفظوں کی الٹ پھیر ہے۔ مضمون پیار سے شروع کیا۔ تشبیب کے دو چار شعر کہہ ڈالے وہاں سے گریز پھر مدح پھر دعا چلو قصیدہ ختم ہوا۔

آج کل تو تعلیم بالغان کا بہت چرچا ہے لیکن اس مقام پر حکیم جی نے شعروشاعر کے ذریعہ سب سے پہلے تعلیم بالغان کی ابتدا کی اور بے مشی کامیابی حاصل کی۔ ہر بچے بوڑھے اور جوان کو لکھنے پڑھنے کا شوق ہو گیا دکاندار پٹواری، تھساب ہراز تانگے والے، بنجار، لوہار، عرض کہ جسے دیکھو کوتیا کی دھن میں ننگا رہتا تھا اور شرگھڑتا دکھالہ دیتا تھا پھر بلف پھر کسی پر شمع اپنے رنگ میں کہتا تھا نگرینہ کا رنگ ملا حنہ ہو۔

بلدی لگے نہ پشکری اور رنگ جو کھا اٹے فوں تھوکیں بزم غریب گربان

کھدیں ہم تانگے والے کا ہنہ زوری اور پاک دستی ملاحظہ ہو۔

نواب گوند شیرہ اینٹ کی مسجد پر ہے گھنٹہ پر وہ بھی خدا کے فضل سے اُن کا مکان نہیں
جس نے ملنے میں حکیم جی بھوپال میں تھے اس وقت وہاں بہتر سے بہتر کہنے

والے شعراء موجود تھے منشی امیر احمد میناٹی لکھنوی کا آمد وقت بھوپال میں مارکا
تھی ان کے قابل قابل شاگرد وہاں موجود تھے حکیم برہم صاحب مرحوم ایڈیٹر شرق

یاس لکھنوی، منشی مظفر حسین صاحب صبا، مولوی عبدالواسع صاحب صفاء پرنس
جامعہ عثمانیہ، منشی نیاز احمد صاحب نامی خیر آبادی، منشی قاسم علی صاحب بیدل اور

بھوپال کے مایہ ناز منشی سراج میر صاحب سحر، حکیم محمد صاحب شہید اور طلب

دہلوی وغیرہ یہ سب بچاٹے خود اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے لیکن حکیم صاحب

کے سامنے کسی کا چہرہ نہ جلتا تھا اور اُن سے ہر ایک اس ادب و احترام

کے ساتھ حکیم جی سے ملتا تھا جس طرح ایک شاگرد اپنے استاد سے ملتا ہے اس کی

دجہ یہ تھی کہ پبلک پر حکیم جی کا پورا پورا اثر تھا اور ہر شخص چاہیے وہ عالم ہو یا جاہل

دل سے اُن کا ادب و احترام کرتا تھا۔

مشاعرہ کرنے کے معاملہ میں حکیم جی ملک الشعراء تھے ادھر کسی کی شادی

ہوئی اور ادھر مشاعرہ لے لو کسی کے یہاں بچہ ہوا مشاعرہ، کوئی بیمار ہوا،

مشاعرہ، کوئی مرا مشاعرہ غرض کہ مشاعرہ کیا تھا ایک حیلہ تھا پھر خرچہ کچھ بھی

نہیں۔ تانگے والوں نے قندیلوں میں سے موسم بیتیاں نکال کر ڈھیر لگا دیا۔

ہنرانہ نے چاندی کے پاٹ لا بچھاٹے، خیمے والوں نے اوپر سے ڈیرے ڈال دیے

پتواری نے گوریوں کے ڈھیر لگا دیئے، پاٹے خانہ والوں نے چاٹے نوشی کا

انتظام کر دیا۔ گڑا کو فروش نے ہر دم تازہ حقے اور کلیاں فراہم کر دیں حکیم جی

نے غزلیں کہیں دیں یا بتا دیں اور یار لوگ اکھاڑے میں جا کورے۔ چلو تین ایک

نہ دنیا دو۔ مشاعرہ ہوا مہنی خوشی ہوا۔

مشاعرے کے دن حکیم جی کا ٹھاٹھ دیکھنے کے قابل ہوتا تھا پتھر کی
زیب سرکبت جس کی بندش نرالی بلکہ بین الصوبہ جاتی ہوتی تھی۔ دو پلوں پر
جودھ پور میں تو دو تین جے پوری، پچھلا حصہ مار وارڈی ہے تو اگلا بھوپالی تو
کچھ مدراسی ہے تو کچھ پنجابی ہے۔

غرض کہ جوں جوں کامریہ تھا جو خیمے کی شکل میں سر پر دھرا رہتا تھا
اس پر طرہ یہ کہ منڈالے کا ایک سزا اگر طاوس کی کلفی کی طرح سر سے ایک فٹ بلند
ہو کر طرہ امتیاز بنتا تو دوسرا پس پشت بن کر مقدار علم ظاہر کرتا رہتا وہ جب
چاہیے اس کو سر سے اتار ماتھ میں لچکول کی طرح رکھ لیتے اور جیب چاہیے سر پر
اُلٹ لیتے مگر اس کے بندیش اور تاروں میں بال برابر بھی فرق نہ آتا تھا پرانے
نمونہ کا غرارہ اور پٹویا ہمو کی شیر والی زیب تن کرتے جو گردن پر چار انگلی
ڈھیلی اور کمر پر کھینتی رہتی تھی سینہ و مال جیب میں اور جاپانی قسم کا رنگین
پاتا بہ پاؤں میں پہنے اور اس پر پیٹ لیڈر کی وہ نوک دار گرگانی ڈالتے جس کے
پہرے چلتے دست ہو چوکہ ہدائیں نکلتی رہتی تھیں آگے، آگے وہ اور پیچھے
پیچھے ان کے شاگرد بغل میں بستہ دباے چلتے تو بس اُن پر صادق حسن کا یہ شعر
صادق اس کا تھا کہ

عقب ان کے پٹواریاں خیل خیل قلمدان بغلیں ہن دستان میں بستہ
مشاعرہ کے انتظامات میں انھیں خاص ملکہ تھا وہ خوب جانتے تھے کہ کون
کتنے پانے ملا ہے اس لئے ہر ایک کو اُس کے علم، استعداد اور رشتے کے مطابق سلسلہ
دار بٹھاتے تھے۔ ہر ایک کا خیر مقدم اس کے رشتے کے مطابق کرتے کسی کا
استقبال سلام سے کسی کا صرف ہاتھ اٹھا کر اور کسی کی پیٹ تھپک کر کہتے کہ
یا اچھا تم بھی شاعر ہو گئے۔ آج تمہارا اور اُس بیوقوف کا مقابلہ ہوگا۔ جاؤ تم اس
کے پاس جا بیٹھو کسی کا استقبال ذرا آگے بڑھ کر کسی کے جوتوں کے پاس پہنچ

کر اور کسی کا جوتوں سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر استقبال کرتا ہوتا تھا
 میں ملتا تھا ڈالے ہوئے لاتے اور کہتے کہ بھئی تمہارے دیکھنے کو تو آنکھیں،
 ترس گئیں ہیں تمہارا انتظار تھا بھئی تم میرے پاس بیٹھنا
 لو بھال تم وہاں بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔

جب تمام شعراء جمع ہو جاتے تو مشاعرہ کی کاروائی شروع ہوتی
 شمع گردش میں آتی پہلے نوشق، پھر متوسط اور آخر میں کہنہ مشق شعراء کے
 سامنے سے گردش کرتا ہوتا حکیم جی کے پاس پہنچتی اور سب سے آخر میں یہ اپنے
 جوہر بتاتے پہلے عینک لگاتے پھر اپنا دیوان کھولتے پلٹے جاتے اور ورق پر ورق
 لٹے جاتے عینک پھیلنے پھیلنے ناک کا پھنگ تک آجاتی اور نظر کے تاری میں
 حالت وجد میں چشمہ کے تالوں پر سے کود کود کر صفحہ قرطاس پر قلا بازیاں دکھاتے
 رہتے اس الٹ پھیر میں اپنی کوئی غیر طرح غزل پسند آ جاتی تو وہیں ہاتھ روک
 دیتے فوراً دھنا ہاتھ ماتھے پر آ جاتا اور بائیں ہاتھ کا دو انگلیوں سے ڈاڑھی کے
 بالوں کو پکڑ پکڑ کر اس طرح ہاتھ جلاتے جیسے کوئی مانجھا سوت رہا ہے۔

اس اینچا سانی میں اگر اپنی غزل کے ردیف میں کوئی غزل غالب کا یاد
 آ جاتی تو پھر ایک ٹھنڈی سانس کیچتے اور بلند آواز سے اُسے پڑھتے اور غزل
 ختم کرنے کے بعد اپنا دیوان ایک طرف ٹپک دیتے۔ حکیم جی کے پڑھنے کا
 انداز نہرالا اور آواز ہلاک تھی محفل میں شعر پڑھتے تو معلوم ہوتا تھا۔ کچھا
 میں شیر گونج رہا ہے۔ غزل پڑھنے سے پہلے شمع اپنے سامنے سے پرے
 رکھ دیتے مگر جب شعر ختم کرتے تو خود شمع سے چار ہاتھ آگے بٹھے ہوئے
 دکھائی دیتے واہ واہ اور ماشاء اللہ کے نعروں سے فصحاء گونجتے،

۱۹۸۰ء میں جب غزل ختم کرتے تو ایک خاموشی کا پردہ پڑ جاتا تھا۔

۱۹۸۰ء میں شاہجہاں بیگم سابقہ فرمانروائے بھوپال سرطان

تھے عارضہ میں مبتلا ہوئیں اور اسی مرض میں ان کا انتقال ہوا رعایا میں ایک
 اندر دنگ اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ خاتقا ہوں میں ختم پڑھ جاتے تھے
 مسجدوں میں دعائیں مانگی جاتی تھیں اس بیماری کی وجہ شاعرہ اور ناز رنگ
 کہ جلسے بالکل بند تھے۔ ہمارے حکیم جی کباب سینخ کی طرح کر دیں بدل رہے
 تھے۔ اور ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے اُن سے یہ نہ دیکھا گیا کہ مولوی
 اور کٹھن ملا تو مسجدوں میں دعائیں مانگیں اور بے چارے شاعر جکے گھروں میں
 بیٹھے تماشا دیکھیں اور قافیہ پیمای کرتے رہیں۔ تاہم فوراً اُن تھے اور ایک
 شاعرے کا انتظار کر دیا۔ وال پوسٹرس دیواروں پر جگہ جگہ چسپاں ہونے لگے
 اور اشتہارات تقسیم ہونے لگے کہ غلام تاریخ امام بارگاہ میں شاعرہ قرار
 پایا ہے۔ معرعہ طرح بھی ایسا پھر کتا ہوا دیا کہ جس نے سنا وہ پھر ک اٹھا
 اور اس شاعرہ میں شدید ہونا فرض عین سمجھا۔ معرعہ طرح بھی بہن لیجے۔

یارب میری سرکار کو جلدی سے شفا دے

اب کیا پوچھنا تھا۔ سارا بھوپال ایک دم شاعر بن گیا جس کو دیکھو
 چٹا ہوا انگر کا زیب تن کیے رنگ برنگ کے مشرودے کے پاجامہ پہنے، سیلے
 شملے یا منڈاسے باندھے کلمہ کا انگلی میں جو نا سیدھے کلمے میں گٹکا دباٹے
 کاندھے پر رومال پاتھ میں ڈنڈا ماش کے آٹے کی طرح اکڑے ہوئے شاعرہ
 میں چلا جا رہا ہے مغرب کے بعد سے رستم چلنا دشوار ہو گیا۔

نوبے شاعرہ مشرودے ہوا اور ایک رات اور ایک دن برابر ہوتا
 رہا لوگوں کو جب زمین پر جگہ نہ ملی تو دیواروں اور درختوں پر چڑھ گئے لوگ
 درختوں پر اترتے چڑھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ فرشتے آسمان سے

ترہیں اور زمین سے آسمان پر آ جا رہے ہیں پھر لطف یہ ہے کہ ادھر زمین پر
 غزل ختم ہوئی اور ادھر آسمان سے غزل خوان شاعرہ ہو گئی گردن اٹھالی

تو بکری دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب چنگ پر بیٹھے بلبلی ہزار داستان کی طرح
چمک رہے ہیں واہ واہ اور سبحان اللہ کی صدائیں درختوں کی شاخوں اور
جھاڑوں کی پھنگیوں سے نکلی رہی ہیں۔ گویا شاخوں یا لہجوں بالام سے
اپنے سنہن کی داد لے رہے ہیں۔

دوسرے روز سب آفریں حکیم جی کی باری آئی انھوں نے مسدس پڑھا
جس میں تمام انبیاء بزرگان دین، شہداء اور مشائخین کے واسطے دے دے کر
دعائیں مانگی تھیں ہر شعر پر آتیں آمین کا وہ شور و غل تھا کہ زمین و آسمان
گونج رہے تھے یہ مسدس اپنے اثر کے لحاظ سے نہایت ہی لا جواب اور بے مثل تھا اور
ہیوں تک سڑکوں پر لڑکے گھروں میں لڑکیاں محفلوں میں گویئے اور اخباروں اور
رسالوں میں ایڈیٹر صاحبان اسی کا راگ گاتے رہے۔

۱۹۰۸ء میں حکیم جی حیدر آباد آئے یہاں کی شان نزول بھی سن لیجئے
اسی سنہ میں مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم بھوپال گئے وہاں حکیم جی سے ملاقات
ہوئی۔ چند روز تک حکیم جی سے اپنا علاج معالجہ بھی کروایا۔ حکیم جی بلا کے فیاض
تھے قرض سے زیادہ ان کی محبت کو بھی پا گئے دوا کے ساتھ ساتھ شعردسنن کا
چننا رہ بھی دیتے رہتے تھے مولوی عزیز مرزا صاحب تو ایسے لوگوں کی ٹوہ میں رہتے
اللہ دے اور بندہ لے چلتے وقت ان کو بھی اپنے ساتھ حیدر آباد لے آئے پھر کیا
تھارات دن شعردسنن کی مجلس گرم رہتی اور حکیم جی بلبلی ہزار داستان
کی طرح چمکتے رہتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ مرزا صاحب ان کو ہمارا جہ کش پٹو
بہادر بمیں سلطنت کا خدمت میں تعارف کیلئے اپنے ساتھ لے گئے حضرت
شاد حکیم جی سے مل کر بہت شاد ہوئے اور کلام سننے کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔
حکیم جی نے کہا سرکار! قصور معاف میں کوئی نقال نہیں تو ال نہیں ڈوم نہیں
گویا میں جو اپنی پیرائے غزلیں یاد کر کے درباروں میں سناتا پھروں۔

اگر واقعی سرکار میرا کلام سننا چاہتے ہیں تو کوئی طرح عنایت ہو اسلہ پر
ابھی غزل کہہ کر سرکار کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں وہ مسکراٹے اور اپنی بیاض
کھول کر طبع آزمائی کیلئے اپنا ایک مصرعہ دیا۔

ادھر دل شاد ہوتا ہے، ادھر ناشاد ہوتا ہے
کہتے ہیں کہ چہار جہ نے یہ بھی فرمائش کی کہ حکیم جی! مادر زاد کے قافیہ
کو نہ بھولیے گا حکیم جی نے فوراً بندرہ یا سولہ شعر فی البدیہ کہہ کر سنائے اس
غزل کے دو چار شعر مجھے بھی یاد رہ گئے ہیں۔ وہ آپ سن لیجئے
جہن میں ہر طرف شور مبارک باد ہوتا ہے
کوئی بلبل اسیرِ شجرہ صیاد ہوتا ہے

غسم دشادی پیارے کتے جاتے ہیں زمانے میں
ادھر دل شاد ہوتا ہے ادھر ناشاد ہوتا ہے
تصور بھی دلی دیراں میں اب آتا نہیں اُن کا
کوئی اجڑا ہوا گھر بھی نہیں آباد ہوتا ہے

ازل سے یہ اسیرِ دامنِ شمشاد آئی ہیں
گلو میں قمریوں کے طوقِ مادر زاد ہوتا ہے
حکیم جی کو اصلاح دینے میں کمال حاصل تھا، ادھر شعر سننا ادھر بنا دیا پھر
کمال یہ خیالات یا جذبات جوں کے توں صرف انھیں نفلوں کی الٹ پھیر سے
شعر کو زمین سے آسمان پر سجا دیتے تھے ایک دن کرنل بسم اللہ بیگ اپنا یا کسی
دوسرے صاحب کا شعر سنار ہے تھے شعر یہ تھا

تف ہے قسمت بلبل پر کہ شاخ گل پر بوٹے گل بھی نہیں سونگھی تھی کہ صیاد آیا
کچھ لگے میاں! بوٹے گل سونگھا کی پیلے یوں کہو۔
تف ہے قسمت بلبل کہ شاخ گل پر پر بھی بھلائے نہ پاٹے تھے کہ صیاد آیا

اگر اس سے زائد آپ کچھ اور سُنا چاہیں تو وہ بھی سُنیے طفر علی خاں صاحب کے
داکر نامہ میں جو یہ شعر ہے۔

عزیز مرزا صاحب بایں تدبیر دایں دانش
اٹھا سکتے نہیں ہیں سامنے وہ تیرے سروا کر

اس کے متعلق لوگوں کا بیان ہے کہ ان ہی کی جودت طبع کا نتیجہ ہے اور
یہ کچھ چمکتی ہوئی بات بھی ہے۔ اس لیے کہ حکیم جی مولوی عزیز مرزا صاحب کو
عزیز مرزا صاحب کہتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا طفر علی خاں صاحب نے،
خود کو پوشیدہ رکھنے کیلئے حکیم جی کی اس اضافت کا استعمال کر لیا ہو۔

۳۸ شرف میں پر بھنی شاعروں کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ دامد بیگ اولیٰ،
تعلقدار غالب اور موسیٰ سے اپنا رشتہ ملاتے تھے مولوی ابوالحمید صاحب آزاد خود
داغ کاٹ گرد ریشید بتلاتے تھے۔ مولوی صدیقی احسن صاحب فہم بلند پایہ شاعر
گئے جاتے تھے، مولوی انور علی صاحب انور آسمان شعر و سخن کے مانتاب اور خورشید
حسن صاحب برج سخن کے آفتاب گردانے جاتے تھے عرض کہ بڑے سے بڑے
عہدہ دار سے لیکر چھوٹے چھوٹے اہلکار بلکہ امیدوار تک شاعر ہی شاعر نظر آتے
تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ حکیم معشوق علی خاں جوہر دہیں موجود تھے پھر کیا تھا
بنیلف اور چہرہ اسکا تحصیلدار اور دفعہ دار بھی بغیر قافیہ اور ردیف کے بات نہیں
کرتے تھے۔ انور علی صاحب انور نے ایک موقع پر ان شعراء کے نام گنوائے
تھے وہ آپ بھی سُنیے۔

کیسے کیسے جمع ہیں تازکی خیالِ ذلکتہ ہم

بزم بہ بزم سخن ہے یا کہ ہے صبح بہار

تیرو بادِ ہم، قاضی اظہر مقید
ارتق دیرتی پنج اقبال و جگر شیریار

ہر سخن جانی سخن زاد و جو ہر اشتہاب
جہاں کا ہر اک شعر گویا قامتِ غنائے یار

ایسے ایسے نکتہ سنبھال لقمای کا حضور
خاکِ چمکے انور کینچ بے زبان و خاکسار

اتفاق سے ایک و دنیا پوئی سواروں کا نعرہ لگاتے ہوئے ہم بھی پرکھنی
جا پونے حسن اتفاق دیکھئے اس روز رات کو جشن سا مگر منایا جا رہا تھا میں اور
حکیم جی گھر پہنچا تو یہ دیکھتا ہوں کہ یار لوگ بیٹھے ہوئے قیعدے بکھڑے
ہیں انھوں نے پہلے ایک صاحب کو قیعدہ لکھوایا پھر دوسرے صاحب کو لکھوایا اور
آخر میں اس بکر اور قائم میں اپنا قیعدہ بھی لکھ ڈالا اب ان تینوں قیعدوں کے
دو دو چار چار شعر سنئے اور ان کی بدیہ گوئی کی داد دیجئے۔

قیعدہ ۱۔

جمد کے لائق ہے خلاق زمین و آسمان ہے شنایا جس کے قاصر ہر عالم کی زبان
طلحہ بخشا ماہ کو تابشِ نور اس سے ہو نور بخشا ہر کوتاہِ دشنی پاٹے چہاں
باغِ عالم کو بیا عز و وقار فصل گل فصل گل پر لالہ دگی ہو گیلے ہلکراں
پتہ پتہ ہر شجر کا ہے مطلعِ نور ہزار تالچ فرمان میں ہر نخل چمن کی ڈالیاں
قیعدہ ۲۔

موسم گل آگے رخصت ہوئی فصلِ خزاں اور بھمبھد ہے لطفِ سرو باغ و آسمان
ہے ہر اک نخل کی ترسہ ہر دسانہ چھین قامتِ سرو چمن ہے اشکِ تدہرِ سمان
ڈالی ہوئی ہے چمن کا بسکہ چو کوئی ڈالی پھٹ پڑی ہے پتہ پتہ پر بہارِ آستان
قیعدہ ۳۔

اور قیعدہ ۳ کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے

ہے دماغِ افروزانِ روزوں بہارِ پوستیں
کپاٹے کیوں کر ملے کیے مزاجِ باغیاں

سرد تھا اب دیکھے جس کو ہے وہ اکڑا ہوا

کڑوا نخت کا انھیں بد پھٹ پڑا ہے آسمان

ذوق دھل گئی میں بلبل کو نہیں اتنی خبر

شام ہوتی ہے کہاں اور صبح ہوتی ہے کہاں

نگھٹ گئی پھرتی ہے گلشن میں اترائی ہوئی

کیوں نہ ہو بھر عرش اعلیٰ پر دماغ ماجیں

اس نئے انداز سے آئی ہے کہ اب کے بار

کیوں تھا چھایا ہوا ہے پرتھی پہ اک سماں

یہ تمام قید سے نئے کے بعد بھی سامعین کی طبیعت نہیں بھری صاحبِ صناعت نے
مکر تمام قید سے نشتے کی فرمالیش کی اور دوسرے روز چمن میں یہ مشاعرہ ہوا
بھلا حکیم جی کہاں جو کئے والے تھے انھوں نے وقت اور جگہ کی مناسبت سے اپنے
شاگردوں اور یار دوستوں کو نئے قید سے لکھوا دیئے صرف ان کے قید سے کے
دو چار شعر آپ سن لیجئے فرماتے ہیں۔

جھومتے ہیں فرطِ عشرت سے جوانانِ چمن

تھر تھر سے نرزد ہے شانِ ایوانِ چمن

صحنِ تیسر قمری ہے صاف میدانِ چمن

لفظ پر ہے ان دنوں صحنِ عروسیں چمن

گرم جائیں لڑا کھڑا کر سر پرستانِ چمن

پھرنے سر سے سجائے جائیں ایوانِ چمن

بھر سال گلشنِ مذمت ہو ہمانِ چمن

بہر خدمت آج حاضرین ہوں ارکانِ چمن

غرض کے حکیم جی نہایت ہی پرگھوڑ میں اور موزوں تھے شعر دماغ پر فود خود

صد محمد آج فصلِ گل ہے ہمانِ چمن

نبرہ صحنِ چمن ہے فرشِ مخمل کا جواب

شامیلے انھیں گردن کے ہے ہر سو تنہا

پتہ تپا ہے کف دستِ جین کا جواب

از کے تڑکے ہی چلائی اٹھ کے شبنمِ فوج سے

کار پر دازانِ گلشن کو ہوا ہے حکمِ آج

پھر نئی صورت سے ہوا آراستہ باغِ سخن

موتیا، پیلا، جھیلی، موگرا چمپا گلاب

ٹھیک کر کے بان پر چلے گئے تھے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو ایک ایک گھنٹے میں تیس تیس
 ہزار ہاں تیس شعر کہہ ڈالتے تھے قلم کی زبان کند ہو جاتا مگر ان کی زبان ہمیشہ
 لڑکھرائی تھی جب چاہتے ضلع جگت کو دعا عایت انظر اور بھی کو رفعت دے کر تشبیہ
 کر دیتے اور جب چاہتے خبر کو انشا اور مسادات اور اعتبار کو ایمان کے سانچے میں
 ڈھل کر معمولی سی بات کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیتے ضلیح لفظی اور معنوی
 عروض و قافیہ اور الفاظ کی تراش خراش میں انھیں کمال حاصل تھا۔ سب سے تصنیف
 چہلم ابہام حسن العسل طباور غرض کہ جس صفت کا ذکر آیا اور انھوں نے اس میں باتیں
 شروع کر دیں۔ قصے پر قصہ اور شعر پر شعر گھنٹوں سناتے رہتے تھے۔ کہتے ہیں شاعر
 سے شعر نہیں کہا جاتا اور شاعری سے شعر پہلی بات تو سولہ کہنے ہے کہ شاعر سر
 ٹپک کر رہ جائے تو شعر نہیں کہہ سکتا مگر دوسری بات مانتے کھیلے میں تیار نہیں ملنے
 دیکھا کہ حکیم جی شرماری ہی نہیں بلکہ شریعہ و تقیہ، ضلع اور دوز غرض کہ ہر شعر پر
 حاوی تھے اور بے تکلف اپنا شبہ نیز قلم صغیر قرطاس پر دوڑاتے رہتے تھے
 بلکہ بچوں کھیلے قصے کہانیاں اور یار دوستوں سے خط و کتابت بھی مختلف منقوش
 میں کرتے رہتے تھے صفت غر منقوش میں ان کا ایک خط ملاحظہ فرمائیے

لکھتے ہیں

والا گہر

کل طوطا و قوم بدکار محکمہ مال کا کارڈ ملا اور آم کا اک ٹوکرا
 وصول ہوا مورد چہرہ دکر کم ہوا اور اس دم سرکار کا مرسلہ مرسلہ
 رسالہ الجلال مسودہ کلام اور سر دار گوہر سرور کا لکھا ہوا سورہ
 الحمد کا حصہ ملا۔ دل مسرور ہوا سرور کا سکے مسکو کی ادکا المی
 بدد ہوا۔ لہ کلام کلام سرکار کو کلام الملوک ملک الکلام کہو ملک
 گوہر سرور کا طہور اور مدح کسی طرح ادا ہوا ہر سطر کو سلک گوہر دار

اور ہر داڑھ کو سلک مسلسل لکھو سوگم۔

ہمارا حال معلوم ہوا ہوگا ماہ دو ماہ کا عرصہ ہوا کہ سکھ درد
اور آزار تم ہوا ہوا ہر گام مورد الم ہوا۔ ہر اک کا گل مراد کھلا
مگر کام انکار ہوا سو ہمارا ادھر ٹوٹا ہوا دل اور ہم اور ادھر
دام و درم کا الم حواس کو کس طرح ادراک ہو رحم کر
اور کس کا پہرا ہو سر گردہ راسن راہ کا
اسرا اللہ اور اسل رسول اللہ کا

حاصل کلام

سرکار کو سلام اور طوطا رام کو رام رام

دعا گو

گو ہر

حکیم جی کیا کرتے تھے کہ صفت بے نقط ہوا منقوط، متقولہ، معکوب ہوا
تفہم، پہلہ ہوا واسع راتفسی یہ سب ضائع، لغلی ہیں۔ اور ان سے
اہل ادب کو احتراز لازم ہے ہاں لطیف گولا کی حد تک یہ صفتیں کام کی
میں اس سے زیادہ مریض کا تو پھر خدا ہی ملا نہ وہاں صنم نہ ادھر کے رہے
نہ ادھر کے رہے تجنیں، خلی کا ذکر آیا تو ایک لطیف سنایا کہ ایک منشی جی
کسی کلکٹر کے اجلاس پر کام کرتے تھے ایک عرضی آئی، منشی جی نے اٹھائی
اور سنائی شروع کر دی ختم پر کھاتا تھا۔

راقم بابو ولد نقو قوم گھوڑا پیشہ پواری ساکن پیل ماندھا

اسے منشی جی نے پڑھا

راقم بابو ولد ٹو قوم گھوڑا پیشہ سواری پیل سے ماندھا

بعض لوگ شعرد شاعری میں استاد دی اور شاعری کے قائل ہیں۔

اس لیے کہ شعور شاعری کوئی گانے بجانے کا فن تو ہے نہیں کہ کہیں استاد نے
 گنگڑی تبا دی، اور کہیں تالی و سر درست کر دیا۔ شاعری تو ایک کیفیت کا نام ہے
 جو طاری ہوتی ہے اور شاعر اپنی زبان میں ادا کر جاتا ہے۔ اب بھلا اس میں،
 اصلاح دیتے کے کیا معنی ہیں مگر حکیم جی کا معاملہ بالکل برعکس تھا وہ اس
 قول کے ساتھ اصلاح دیتے تھے اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔
 خیالات اور جذبات کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ مضمون جوں کا توں رہتا اور
 صرف لفظی الٹ پھیر سے وہ شعر کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیتے تھے۔
 یا کم سے کم شاعر کو صحیح رستے پر لگا دیتے تھے۔

ایک دن کو شر علی صاحب مرثیہ گو نے کہا کہ حکیم صاحب میرا سچ کر دیجئے
 حکیم جی نے ذرا سوچ کر کہا مالک کو شر محمدؐ سا بعد کو شر علی
 رفیق بیگ نے کہا کہ حکیم جی صاحب لیجئے بھی فرما دیجئے کہنے لگے
 رفیق محمدؐ محمدؐ رفیق۔

ایک مرتبہ میاں بدر اور فرید بیٹھے ہوئے حکیم جی سے گپیں مار رہے
 تھے آنا قد سے باہر مرزا صاحب آدھکے۔ کہنے لگے حکیم جی! میں ابھی مومن خاں
 کا دلوانا پڑھ رہا تھا۔ عنوان تو ہے۔ نام مومن خاں اور نیچے شعر لکھا ہے۔

کیفیت دھمال بس اب کچھ نہیں رہی
 کیونکہ نہ ہوں طول میں شب کچھ نہیں رہی

کہنے لگے میاں یہ تو معہ ہے معہ تم تو اب چراغ خوب جلتے ہو بس
 یہ وہی صاحب ہے دیکھو طول میں شب کو نکال دو یعنی شب کے حروف تفریق
 کو دو تو باقی حروف مومن خاں کے رہ جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ حکیم جی وہ
 کس طرح تو فرمایا طول میں شب۔ ج۔ ہی اور ن ہے اور شب کو عربی کہتے ہیں
 لیل اب لیل کے حروف طول میں سے خارج کر دیں تو مومن رہ جاتا ہے

بہار بیابان کو اس الٹ پھیر اور جمع تفریق بیجم سے لغت نعمت ہو۔ چھوڑ گئے
 گئے کہ بیابان حیرت کس بات کا ہے امیر خسرو نے جو اپنے نام کا معنی کیا ہے
 وہ تو اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ وہ کہتے ہیں

نام بت من اگر بدانی سر بے دست نہادہ بر سر سرد

یعنی سرد پر تین بے لگاؤ تو خسرو ہو جائے گا اور وہ اس طرح کہ ایک
 کے حساب سے ب کے دو عدد ہیں۔ اس لیے تین ب کے ۶ ہونے۔ ۶ کو ناکہ
 میں شش کہتے ہیں اور شش کے میں تین سو اس حساب سے ادشش کے چوٹے
 ۶۰۰ اور ۶۰۰ عدد ہیں خ اب خ کو سرد پر لگاؤ تو ہوگی خسرو۔

بھالائے فرحت نے کیا کہ حکیم صاحب یہ مضمون کا معاملہ تو نہایت
 نازک اور دشوار گزار ہے ایسے تو گنتی کے نام نکلیں گے جن کے معنی کئے
 جاسکتے ہیں کیا کہ خاک بھی دشوار نہیں دیکھو تمہارے نام کا معنی ہے۔

عاجزہ انداز درک ناش خاص و عام

در بقا شد ثروت قسار شود

یعنی بقا کے ق کو در کر دو تو بدر ہو جاتا ہے۔۔۔

اس سے بعد فرید سے مخاطب ہو کر کیا کہ تمہارے نام کا معنی ہے
 اول فصل بہار است بیا کا خر روز خوشی بودا من باغ و رخ رلدار
 یعنی فصل کا پہلا حرف ف نو روز کو عربی میں تار کہتے ہیں اس کا آخری
 حرف لے لو۔

دامن باغ لے ہے اور دلوں کا رخ رہے اب ان تمام حروف کو ملا
 لو تو فرید ہو گیا۔ اس طرح تمام لوگوں کے معنی کے اسباب سے آخر میں بہار مرزا
 صاحب سے کہتے گئے کہ دیکھئے اسی شعر میں آپ کا نام نکلتا ہے۔

قبایر قد تویدر دزد آیام

بہار از عافیتا مانی لے سیرنا

حکیم جی الفاظ کا تازگہ اور تبدل کو خوب پہنچاتے تھے، صلح جگت سے خوب واقف تھے اس نے دو لغظوں کے طے سے کوئی برا پہلو پیدا ہوتا تو فوراً ٹوکتے اور شعر کو درست کر دیتے مثلاً ایک صاحب نے پڑھا۔

مہے جسم مشت غبار کو تہ خاک میں وہ ملا گئے

کہنے لگے عقلمند پہلے اُردو تو صحیح کر لے۔ تہ خاک میں بس یہ ویسی ہی اُردو ہے جیسے کوئی کہے کہ معہ اہل و عیال کے با بغضی خدایا اور موٹے لغظوں میں یہ کہو کہ وہ شب اسلمیۃ القدر کی رات کو ساحل لایا کے کنارے کھڑا ہوا اب آرام پائی پڑ رہا تھا۔ تہ خاک میں کے بدلے تہ خاک اس نے دبا دیا یا تہ خاک مجھ کو دب گئے کدو۔ ایک روز شاکر صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

زبانِ حال سے کہتے ہیں گل یہ مر جھا کر

چمن میں فصلِ خزاں کا بہار ہم بھی ہیں

کہنے لگے میاں! کان پیچھے سے ہاتھ لاکر کیا ناکی پکڑتے ہو سیدھی بات کیوں نہیں کہتے۔

تبارِ ہائے ہر اک بھول کا یہ مرجھانا

خزاں رسیدہ چمن کی بہار ہم بھی ہیں

ایک دن میٹھے چوٹے کسی کی غزل پر اصلاح دے رہے تھے اس

نے شعر پڑھا

جس نے دیکھیں تیری آنکھیں ہو گیا سرشار وہ

نشر ساقی کس غضب کا تیرے دو پیالوں میں ہے

بس فوراً اپنے زانوں پر ہاتھ مار کر بولے ارے میاں! یوں پڑھو

جس نے دیکھے ہیں تیسرے وہی متوالوں میں ہے

کس غضب کا نشہ سا قیاس تیرے دو پیالوں میں ہے

حکیم جی الفاظ کی تازگی اور استدال کو خوب پہنانتے تھے صلح جلتے سے
خوب واقف تھے اس لیے دو لفظوں کے طے سے کوئی برا پہلو ہوتا تو دوسرے
کو توہم تک نہیں چلتا مگر وہ فوراً ٹوکتے اور وہی شعر کو درست کر دیتے تھے
چنانچہ ایک صاحب اپنی نظم سنار ہے تھے مصرع پڑھا۔

چاند کی رنگت ہوئی فق ہنہ تمہارا دیکھ کر۔ کہنے لگے اسے میاں
تم پڑھو گے۔ ہنہ تمہارا دیکھ کر اور لوگ سمجھیں گے موت مارا دیکھ کر
اور پنس پڑیں گے۔ اس لیے اسے یوں کہو چاند کی رنگت ہوئی فق رخ تمہارا
دیکھ کر۔

کوئی صاحب کچھ کر لائے تھے درہے بھی بدتر ہوں کہنے کو ہوں
زندہ، سن کر کہنے لگے کہ اس مصرع کے آخر میں گوز زندہ اس طرح بیٹھا ہے کہ
پورے شعر کے ہوا نکلی گئی۔ دیکھو! گوزید کا رسم وہ قاعلی بھی گوز زندہ ہے
میرضامن علی بلال نے مطلع کہا تھا۔

سب ترے ناز میں زندہ ہوا کر نے والے

ڈھونڈھ سینے میں بہانہ کوئی مرنے والے

اس اعتراض کا بناء پر انھوں نے اپنا مصرع بدل دیا۔ گو ترے ناز میں
سب زندہ ہی کر نے والے اس کے بعد گلامار اسی قسم کے کئی شعر مشہور
سنائے اور آخر میں ایک واقعہ بیان کیا کہ کسی صاحب نے مجلس میں یہ
مصرع پڑھا۔ بحر نبی کے گوہر مکتا حسیں ہیں دو لوگوں نے کہا معاذ اللہ تم نے
نبی کیلئے بہرے کا لفظ استعمال کیا جو ٹھیک نہیں ہے۔ انھوں نے فوری
بدل کر پڑھا کان نبی کے گوہر مکتا حسیں ہیں۔ لوگوں نے کہا واہ واہ

دیکھتے ہی پڑتے کہہ اعد آپ کانے بنا دیا۔ شاعر صاحب نے پھر گھبرا کر پوچھا تھا
 گنج دہی کے گوہر یکساں ہیں میں لوگوں نے کہا کہ تم ہرگز اس قابل نہیں کہ تمھارا کلام
 سنایا جائے نہی کی شان میں معاذ اللہ کیا کیا بے ہودہ کچے بکتے ہو۔ کبھی،
 ہرے بکتے ہو کبھی کانے اور کبھی گنچے۔ شاعر صاحب اپنا سر کھجی کر چل دیے۔

حکیم جی کے زیادہ تر مقدمات یا تو عدم پیروی میں خارج ہو جاتے
 یا بعض اوقات شاعرانہ انداز کا قانونی بحث کرنے کے بعد خارج کر دیے
 جاتے تھے۔ مثلاً حکیم جی عدالت تشریف لے جاتے تو بعض اوقات انھیں
 یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ میں وکیل کس طرف سے ہوں شعر پڑھتے اٹھے
 گون بعل میں دایا بگاڑی میں سوار ہو عدالت جا پہنچے اور یار دوستوں سے
 باتیں شروع کر دیں اسی گفتگو کے دوران میں ذرا پلٹ کر دیکھا تو فوراً
 ایک صاحب نے فرشی سلام مارا پوچھا تم کون؟ سرکار میرا مقدمہ ہے۔
 پھر تم یہاں کیسے؟ کہا سرکار عدالت ہے، اچیل ہے اور آپ وکیل ہیں۔
 حکیم جی ہاں یاد آیا کیا مقدمہ ہے؟ جی دہکا بھی کے تہلکا۔

حکیم جی۔ بھلا تمھارا نام کیا ہے؟ جی! مراد خاں
 اچھا مراد خاں۔ حکیم جی نے اپنی ڈاڑھی کریدتے ہوئے کہا ذرا اس
 مقدمہ کے واقعات جھٹ پٹ سناؤ والو۔ واقعات سن کر کہا۔ اچھا مجھے
 معلوم ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پکار ہوئی حکیم جی اجلاس پر بیٹھے ایسے جاریہ کا
 سرٹیفکیٹ اور کمپلی انکوائزیشن وغیرہ کا صداقت نامہ اور گواہوں کے بیانات
 گورنمنٹ ایڈوکیٹ جنرل کے بعد حاکم عدالت نے حکیم جی سے معائنہ ہو کر
 کہا کہ رویداد مکمل سنانے کا ضرورت نہیں آپ اپنے موکل کے برات میں

جو کچنا چلتے ہیں کھیتے۔ حکیم جی یہ تو خدا ہی سے چلتے تھے فوراً سر کو جھٹکا دیا تو عینک
 ناک کی جھلک پر آ رہی۔ اب سوچنے لگے کہ مقدم کو صفائی کے گواہوں کی شروعات
 کروں یا کیا؟ تاہم انھوں نے اپنے حافظہ کے ورق لٹے شروع کیے تو
 محسوس کیا کہ جابجا غزلوں کے فیصلے اور قیعدوں کے مسودے ٹکے ہوئے ہیں۔
 حکیم جی نے فوراً لٹپ لپ اور گریز کا خیال کرتے ہوئے اپنے مقدم کی بحث
 حج کو مخاطب کر کے شروع کی سرکار۔ دل دھڑکان کا جو مقدم تھا۔

آج پھر اس کی ادبکاری ہے

گرم بازار فوجداری ہے

پھر کھلا ہے درعدالت ناز

جلوہ بھر عرض ناز کرتا ہے

اور بازار جاں سپاری ہے

شعواء بھی ختم نہیں ہونے پائے تھے کہ حاضرین جھومنے لگے۔ گورنمنٹ،

ایڈوکیٹ نے آپ سے باہر جو داد دی تو عدالت نے وہیں ڈانٹ پلائی۔ حکیم جی

سنجھے اور عدالت کی طرف منہ کر کے یوں گویا ہوئے کہ مغرر عدالت! میں

ایسے ذی وجاحت اور ذی عزت مہزم کا وکیل ہوں جس کے باپ دادا آسمان

عزت و وقار کے آفتاب و مناجات تھے۔ یہ اس قدر سیدھا سادا اور گاد و صفت

انسان ہے کہ مارنا تو کہہ کسی سے جھڑک کر بھی بات نہیں کرتا پھر جس کی نظرت

ایسی اور نظرت بھی ایسی ہو تو بھلا ایسا انسان کسی پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔

اور وہ بھی کسی عورت پر یہ تو اپنے سایہ سے بھی ڈرتا ہے بقول شریف۔

باغ پاکر خفصانی وہ ڈرتا ہے مجھے

سایہ شاخ گل افغانی نظر آتا ہے مجھے

اس موقع پر نہ صفائی کے گواہوں کی ضرورت ہے اور نہ کسی دوسری

کارروائی۔ یہ وقت صرف کرنے کی حاجت ہے پولیس ریپٹ اور گواہوں کے

بیانات سے معاملہ روز روشن کی طرح عیاں اور اظہر ہو گا شمس اپنے سرکار کے

ہاتھ میں میراں عدل ہے سسرکار کا تجربہ، علم اور رحم و کرم کا ستارہ دنیا
میں نام ہے اور سسرکار کا کلام زبان زد ہر خاص و عام ہے چنانچہ۔

قیصہ دیکھنے کا وہ ملکہ کہ عالم میں ہے موم مانتے ہیں جس کو لوہا نصیفان روزگار
نظم و اعلیٰ کہ قرآن جیسہ ہے قلم جہاں نشر وہ نشر کہ جہیز نشر نشر ہو نشر
یہ امر مسلمہ کو تو الی ہے کہ شمشیر پیشا لگا ہے اس کا قابض تیغ علی جمہد ارتقا
اب شمشیر دیکھتے تو آئینے کی طرح صاف اور دم شمشیر دیکھتے تو بلور کی طرح
شفاف ہے پھر گھاٹ اور رخ پر نظر ڈالئے تو خون یا پتھر کا ایک دھبہ بھی
نہیں جس معلوم ہوتا ہے کہ دکان سے ابھی صیقل کرا کر لا رہے ہیں۔ یا یہ کہو
کہ ہمارے خیال کے سج میں یہ میراںیں کی تلوار ہے۔

اللہ نے صفا صفا کیا نکل عدو کا دھبہ نہ لگا دھار میں کافر ہو گا۔

پھر رویت گواہ دیکھتے تو عبد اللہ پولیس پٹیل جن صاحب کانسبل
اور رام ناتھ انسپکٹر خفیہ پولیس، مقدمہ کی تفتیش کرنے والے کون کہ
سپرٹنڈنٹ پولیس اور چیف نام مرتب کرنے والے کون کہ افسران کو تو الی
یہ تو وی کیفیت ہوئی کہ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے نکلے پر نا حق آدمی
مکول ہمارا دم تحریر بھی تھا۔ پھر میاں جیو پٹیل تو کانسبل دوسرے
ستر برس کے بڑھے نہ ہنہ میں دانت اور نہ پیٹ میں آنت، بیٹائی کا
ہم عالم ہے کہ میراں کا رنگ، قلم کی لمیان اور چراسیوں کی وردی تک غلط بیان
کی ہے کھلا رات کے بارہ بجے اس اندھ نے واقعات دیکھے تو کیے۔

رہے فقیر شاہ تو وہ مسلمہ گداڑے شہر، رات کا پیشہ گداڑا اور دھوکا
نظامی عروصہ نے اپنے چار مقالہ میں شاعروں کی خوب خبر لایا ہے بس حکیم جی
بھی اسی کا ڈھول پیٹتے رہتے تھے۔ یعنی وہ اس شاعر کو سرے سے
خبر ہی نہیں گنتے تھے جس کو مشہور و معروف شاعروں کے کم سے کم

دس بارہ ہزار شعر نہ یاد ہوں اور چولی کے ادبوں کے دس بارہ ہزار جڑستہ فقرے نہ حفظ ہوں عروض کے معاملہ میں تو حکیم جی بقول شیخے سگلاں عروض میں سے تھے جیسے شیخہ اُردو میں عروض کا کتا کھر سکتے ہیں۔

چاہے ان کے شاگردوں میں کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر وہ ضرور لکھ رہے تھے

رہتے اور شاگرد بُرا نقشی کی طرح گردن ہلاتے اور چلتے وقت وہ اپنا یہ کارنامہ اس کے گلے ضرور منڈھ دیتے تھے کہتے تھے کہ جو عروض نہ جانتے وہ آدھا شاعر ہے اس لیے کہ بعض بحر میں ایسی ہیں کہ جس میں صاحب فن تو منہ مار کر نکلی جاتے ہیں لیکن صاحب ذوق غلطے کھاتا رہتا ہے۔

چنانچہ ایک مشہور قصیدہ ہے کہ ایک صاحب ذوق سعدی کے اس قطع کو مفعول ثنائی، مفعول ثنائی کے وزن پر اس طرح پڑھ رہے تھے

چہ گفت مرا آن بلبل سحری گر ذوق نیت ترا کز طبع ماموری

اشر لیشو عرب، حالت است عرب تو خود چہ آدی، کر عشق بے خبری

مختصر یہ کہ وہ مرا، سحری، ترا، جانوری عرب، طرب، ردی اور بے خبری ان آٹھواں لفظوں کو زبان مبادک سے مشروط ادا کر رہے تھے ایک صاحب فن نے کہا کہ ظالم لفظوں کے گلے پر تشدید کا آرا کیوں چلا رہا ہے۔ ارے یہ قطع تو بحر سبط میں ہے متغضون نعلان متغضون کے وزن پر کیوں نہیں پڑھتا مگر وہ اڑیلی ٹٹو کی طرح برابر اڑا رہا کہ اگر الفاظ صحیح ہو گئے تو پھر شعر میں جا بجا سکتے پڑے گا۔

ایک دن کسی صاحب ذوق نے شعر پڑھا

جہاں خاک اڑالی وہیں اب رہے ہم

کہ دُرت عبث فکر مدفن سے ہے

کہنے لگے کہ تم نے زبردستی ہم "لاکھ پورے شعر کو دفن کر دیا اگر تمہیں

بحر متقارب کے اوزان معلوم ہوتے ہرگز یہ غلطی نہ کرتے دیکھو پہلے مصرع میں
ہم زیادہ اُسے نکال دو تو شعر برابر ہو جائے گا اسے یوں پڑھو۔

جہاں خاک اڑا لڑ میں اب رہے

کہ دوت عبت فکر مدفن سے ہے

ایک دن کوئی صاحب شعر سنار ہے تھے مصرع تھا یہ

ملا پھر بہادر جنگ ان کو خطاب

کہنے لگے اے حضرت! جنگ میں جنگ کا لون تو شہید ہو گیا ملا پھر
مغولوں بہادر فحولن جنگ ان کو فحولن۔ اس نے کیا حکیم صاحب یہ میرا ہے
ہوا تھوڑی ہے یہ تو صبا کا مصرع ہے کہنے لگے صبا تو صبا اگر فردوسی بھی لکھے تو غلط
حکیم جی نے ایک مشاعرہ کا ذکر کیا جو علی گڑھ میں ہوا تھا دور دور سے شعراء

آئے تھے۔ شاعروں نے اپنی اپنی غزلیں پڑھیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے فرمایا
کہ جناب! میں ایک نظم پڑھنا چاہتا ہوں۔ جس میں میں نے کئی ہزار الفاظ جمع کیے
ہیں جن کو اہل دل اور اہل لکھنؤ بھی غلط بولتے ہیں۔ میرا مشاعرہ نے کہا کہ مشاعرہ
ختم ہونے کے بعد یہ غزل پڑھی جائے تو مناسب ہوگا مگر وہ سر ہو گئے بڑی
رد و قدح کے بعد اجازت ملی انھوں نے فوراً اپنا لبتہ کھولا اور بے وقت کی راگنی
الاپنا شروع کر دی۔ کوئی دو ہزار شعر تھے۔ اور الفا سے لے کر فاش نمونہ یہ تھا

جبراحت غلط اور جبراحت صحیح ہے نجات غلط اور نجات صحیح ہے

شجاعت غلط اور شجاعت صحیح ہے رقیابت غلط اور رقیابت صحیح ہے

دباغت غلط اور دباغت صحیح ہے مساحت غلط اور مساحت صحیح ہے

حقارت غلط اور حقارت صحیح ہے حماقت غلط اور حماقت صحیح ہے

غلط اور صحیح سنتے سنتے لوگوں کی بیجیت اکتا گئی اور جب انھوں نے دیکھا

کہ لوگ ان کی صحت لفظی پر نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالتے تو بچارے خاموش

تبھی کسی صاحب نے یہ مصرع پڑھا۔

اُلٹ دے سے کو ساقی نے مویم ہم میں چلے کشتی

تو وہ بے ساختہ ہو کر بولے حضرت کشتی غلط اور کشتی صحیح ہے۔ پھر کسی حکیم الطبع نے فی البدیہہ ایک قطعہ موزوں کر کے پڑھا جس کا ایک مصرعہ تھا۔

یہ شاعرہ کیا ہوا غضب دارِ حسانہ ہو گیا

وہ پھر بے اختیار بدل کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے صاحب شاعرہ

غلط اور شاعرہ صحیح ہے معاملہ رفع دفع کرنے کیلئے میر شاعرہ نے

ظرفیانہ انداز میں کہا کہ جناب! اُردو زبان آپ کا بہت مشکور ہے کہ آپ نے اس میں اتنی غلطیاں نکالیں۔ وہ پھر اُردو کر کھڑے ہو گئے کہ جناب یہ بھی آپ نے غلط فرمایا دیکھئے مشکور غلط اور شکر گزار صحیح ہے۔ اسی لیے کہ مشکور تو میں ہوں اور شکر گزار اُردو زبان میں۔

مختصر یہ کہ حکیم معشوق علی جوہر کی زندگی کا ایک جھلک ہے جو کہ ان ہی الفاظ میں دکھائی گئی گو حکیم صاحب کو دکالت کا پیشہ اختیار کرنا پڑا حکمت چھوڑ کر لیکن اے میں بھی انھوں نے شاعری کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا وہ شاعر پیدا ہوئے تھے شاعر رہے اور شاعر رہے۔

یہ بات تو بالکل سادہ ہے کہ صرف شاعری سے پیٹ نہیں بھر سکتا تھا اس لیے یار لوگوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ دکالت کی سند بھی حاصل کر لیں حکیم جی پہلے تو بہت جھنجھلائے مگر بعد میں انھوں نے دکالت کی سند بھی حاصل کر لی اور ہمارے شاعر صاحب حکیم سے دیکھ لی بھی ہو گئے آپ کیا تھا گھر پر مر لیتوں کے مجمع کے ساتھ ساتھ موکلوں کا ہجوم بھی رہتا تھا۔

میں کہتا ہوں اگر استادانِ سخن کی بھی اسی طرح تقسیم کی جائے تو حکیم جی

استاد لکڑ کے گردہ میں شمار کیئے جانے کے قابل ہیں ان کے اصلاح دینے میں یہ کمال تھا کہ جس کو چاہتے صاحب دیوان کر دیتے چاہے صاحب شعر تو کیا شعر کا دم بھی نہ جانتے ہوں اور جس کو چاہتے اُس کے سر پر ملک الشعراء کا تاج دھر دیتے اور اس قسم کی اصلاح دیتے کہ اس میں سخن فہمی کا مادہ پیدا ہو جاتا۔

ابن و شیتق قزوینی لکھتا ہے کہ شعر کی دو قسمیں ہیں ایک تو مطبوع یعنی وہ کلام جو دل اور محبت سے نکھا جائے ایسے شعروں میں صفائی، سلاست اور حسن بندش کے ساتھ ساتھ محاکات اور تخیل کی روح بھی موجود ہوتی ہے اور دوسرا وہ جس میں تکلف اور بناوٹ پائی جائے۔ تکرار مردہ ہے خاطر افسردہ ہے قافیہ تنگ ہو رہا ہے مگر شاعر صاحب ہیں کہ ردیف کا دم پکڑے ہوئے میدان سخن میں نوک دم چلے جا رہے ہیں ایسے لوگوں کیلئے اس نے یہ ترکیب بنائی ہے کہ وہ جام کریں گانا سنیں اور جب طبیعت میں نشاط اور سرور پیدا ہوا اس وقت وہ شعر و سخن کا طرن توجہ کریں۔ مجھے اس وقت استاد داغ دہلوی کا واقعہ یاد آیا وہ نہایت بدیع گوئی تھے اُن سے کسی نے پوچھا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اس قدر شیریں شعر کیسے کہتے ہیں؟ داغ نے پوچھا کہ بھلا آپ کیسے کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ میں حقہ بھر داگر پلنگ پر لیٹا تھا۔ کروٹیں بدلتا ہوں، کبھی اٹھتا ہوں، کبھی بیٹھتا ہوں۔ طبیعت ہرزور ڈالتا ہوں تب کہیں مشکل سے ایک شعر نکلتا ہے۔ داغ نے مسکرا کر کہا معاف کیجئے آپ شعر کہتے نہیں، شعر جتنے ہیں۔

بس ہمارے حکیم جی بھی شعر و سخن کے معاملے میں کسی طرح داغ سے کم نہ تھے۔ شعر کہتے تو وہ اُن کے کام کے ہوتے تھے اور وہ شعروں کے ہو کر نہیں رہ جاتے تھے چنانچہ شعر کہتے وقت نہ تو ان کو روحِ بادام طے کی ضرورت ہوتی،

نوتالو پر چنبیلی کا تیل رگڑنے کی حاجت اور نہ کاغذ ہاتھ، ہاتھ میں دبا گئے افیوخیوں کی صورت بنائے دریا گئے تخیل میں غرق رہنے کی ضرورت جو کچھ انھیں

کہنہ ہوتا بیچ اکھاڑے کہتے۔ شور و غل بچ رہا، مذاق ہو رہا ہے اور شعر پر شعر اور قصیدے پر قصیدے کہہ رہے ہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ محمد خاں بھوپالی تمکین نے ایک تصویر بنائی جس میں دریا پر یہ مار رہا تھا۔ اور اس کی طوفانی موجیں پتھروں سے ٹکراتے ہوئے ساحل کے پر خیمے اڑا رہی تھیں نا صلم پر ایک عورت تھی جو بغل میں گھرا دباے سکڑی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ انھوں نے یہ تصویر حکیم جی کو بتائی اس وقت حکیم جی اپنی غزل نکھوا رہے تھے جس کا قافیہ اور ردیف تھا: "دل پاش پاش" اور سبیل، پاش پاش، تصویر دیکھ کر کہنے لگے اور بھی یہ سین بھی مکھ دو۔

تو سنا کر چل دیا موجوں نے تیرے، بھر میں

سر ٹپک کر کر دیا دامانِ ساحل پاش پاش

یہاں علاج عقل میں عقل کے عین کا آنکھ بھوٹ گئی، اور علاج کا صم عقل کے تاف سے جا ملا اب تقطیع کرو تو علاج عقل علائق (فنون) ہو گیا۔

حکیم جی کہتے تھے کہ شعر کہنا بہت آسان ہے مگر اچھا شعر کہنا بہت مشکل

ہے یہی ہیں کہ شعر تو قیاس، اور غریب الفاظ سے پاک ہو، تعقید لفظی اور معنوی سے مبرا ہو روز پُر تا شیر ہو ہر لفظ بلاغت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو بلکہ،

ٹہری بات تو یہ ہے کہ اس میں کوئی خالی یا بڑا پسو نہ پیدا ہو جائے۔ جو بے نادرانہ بن کر تمام خوبصورتی کو غارت کر دے ہمارے خیال کے رخ میں "خدا اے سخن"

تھا چنانچہ گیسو کی مدد میں ایک قصیدہ کہہ کر دریا میں پھونچا۔ مطلع کس زور کا ہے

سُخو "اے تاج دولت برکرت از ابتداء تا انتہا" چنانچہ گیسو خود بھی نکتہ اسی تھا۔

مصرع سنتے ہی توری پر بی ڈال کر بولا، کیا تم تقطیع کرنا جانتے ہو؟ شاہی

نجانے کیا کہ تاج دولت برکرت تقطیع میں تاج دوستی، لبتا برکرت

رہ جاتا ہے اور دولت کے تاج کے بدلے بادشاہ کے سر پر دولاتوں کا تاج رہ

جانتے۔ فوراً تفریح سے اپنا لاعلمی ظاہر کر اور بیوقوف بن کر دربار سے اپنے سر بچائے گی۔

تختے میں کہ اگلے زمانہ میں شاعروں کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی صرف ایک شعر پر شاہجہاں نے حکیم بہدانی کو چاندی سونے میں تلوا دیا۔ سودا کو گھر بیٹھے ہوئے چھ ہزار روپے سالانہ وظیفہ ہو گیا۔ مقصد کے دیوارے پر اٹھارہ ہاتھی جھومتے تھے۔ دور کیوں جاؤ خود اس کو غفران مکان نے ایک مشت اسی ہزار روپے مرحمت فرمائے مگر حکیم جی بچارے کو شاعری سے مرتے دم تک پھول کوڑی کا فائدہ نہیں ہوا۔ سوائے زبانی جمع خرچ کے ایک کوڑی کا فائدہ نہیں ہوا یہ کیفیت دیکھ کر یار لوگوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ دکالت کا سند حاصل کر لیں تو پھر دوبارے ہیں حکیم جی پہلے تو بہت جذبہ ہوئے مگر بعد میں کچھ خیال آیا تو اللہ کا نام لے کر کوشش کی اور بغیر کسی امتحان کے دکالت کا سند حاصل کر لیا یہ لیجئے ہمارے شاعر صاحب حکیم سے وکیل بھی بن گئے اب کیا تھا گھر پر بیویوں کے مجمع کے ساتھ مولوں کا ہجوم بھی رہنے لگا مگر حالت یہ تھی کہ عدالت کا وقت سر پر آ گیا ہے لیکن وکیل صاحب یہاں کہ جھوم جھوم کر اپنے اشعار حاضرین کو سنا رہے ہیں۔ حاضرین ہیں کہ ستانہ دار داد دے رہے ہیں۔ ان کے محرر کو قیدہ ولا اور غزلوں کی ہیضہ نویسی سے اتنی ہمت نہیں ملتی تھی کہ وہ شلوں کو تہذیب دیتا یا کاغذات کو ترتیب سے رکھتا۔ اس کے ہاتھ میں بیاضی رہتی۔ حکیم جی کے زبان پر قیدہ اور اہل معاملہ یا تو اپنا مرثیہ پڑھتے بیٹھتے رہتے یا سلام کہہ کر رخصت ہو جاتے۔

ان کو جس مقدم میں دیکھو حضرت موجود ہیں اور رات کو جس دروازے

پر دیکھو تو حضرت بھیک مانگتے کھڑے ہیں۔ اب رہا قانون امیر تو آپ جاہلان ملال ہیں۔ جتنے قانون ہیں ان کا تفسیر آپ کی زبان اور تشریح آپ کا علم ہے جو کہیں وہ قانون جو کہیں وہ قانون جو کہیں وہ عدالت جو نہ کریں

وہ معدلت جو فیصلہ کریں وہ بے نظیر اور حسن فیصلے کو عنوٰخ کریں وہ نظیر خدمت
میں نظائر پیش کرنا گویا آفتاب کو آئینہ اور پیر طریقت کو رستم بتانا ہے آپ کا تو
کیفیت ہے سہ

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آئے

جاں کا بید صورتِ دیوار میں آئے

ہم اپنے خیال کے یخ میں تانوں کے متعلق سب کچھ کہہ چکے۔ اب فیصلہ لکھنا
آپ کے ہاتھ میں ہے ملزم کو کوشش سے ہراتِ نصیب ہوئی ہے اب اس کا تو فیض
آپ کا قلم ہے اگر اس کے خلاف تجویز ہوئی تو مجھے اپنے موکل کی شرافت پر اعتماد
ہے کہ اجلاس سے نکلنے سے پہلے اس کی روحِ نفسِ عنفری سے پردار کر جائے گا
اس پر رحم کیجئے کہ آپ یہ زندہ درگور ہو گیا ہے سہ

رحم کرنا لم کر کیا بود چراغِ کشتہ ہے

نفسِ بیمار ان دودِ چراغِ کشتہ ہے

مختصر یہ کہ یہ ایک ایسے ذی جوہر استاد کی زندگی کا جھلک ہے جس کے

سر پر علم و فضل کا دستار بھی تھی، سینہ پر علم و حکمت کا تمغہ بھی تھا اور بغل

میں دکالت کا نہایت لا جواب گون تھا۔ لیکن شاعری کے جذبات کا سیلاب ان تمام

بیش بہا علوم و فنون کو خس و فاشاک کی طرح بہا کرے گیا تھا۔ انھوں نے حکمت

چھوڑ دی، دکالت بھی چھوڑی مگر شاعری کو مرتے دم تک ہاتھ سے نہ چھوڑا اور

بھلا چھوڑتے کیسے وہ تو بقول شریف شاعر پیدا ہوئے، شاعر رہے، شاعر مرے۔

مشائیر سے میری ملاقات

(مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم)

حیدرآباد پولٹری سوسائٹی کے اجلاسوں میں مشائیر کی ملاقات کے عنوان سے کئی ممتاز شخصیتوں پر مضامین پڑھے جا چکے ہیں اس مرتبہ مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم سے میں اپنی ملاقات بیان کرو۔ مگر میں اس جسکر میں ہوں کہ میں اپنی کون سی ملاقات بیان کروں اور کن کن باتوں کا ذکر کروں ان کی شاعری کے متعلق کہوں یا نثر نگاری کا ذکر کروں۔ ان کی طرانت کا حال بتلاؤں یا ان کی مزاحیہ نگاری کی کیفیت ظاہر کروں۔ ان کے طے جلفے کے طریقوں کو بتاؤں یا ان کے سریلے بولوں کا ذکر کروں وہ تو ایک ایسے بشار کی طرح تھے جو خود بھی اپنی رو میں بہہ چلے جاتے تھے۔ سب خلوں کو بھی سیراب کرتے تھے۔ ارد گرد کے رقبوں کو بھی شاداب کرتے تھے اور جوان کی رو میں آ جاتا تھا اس کو بھی اپنے ساتھ بہا لے جاتے تھے۔ بیسویں ان کے طفیل سے ترقی پسند شاعر بنے، بیسویں ان کے انوکھے اور نئے نئے نویلے ادیب بنے۔ بیسویں نے ان کے دم سے اپنے فن میں نام پیدا کیا۔ اور بیسویں ان کے مشوروں سے آدمی بنے اور کام پر لگ گئے۔ کئی مصنفین کے مضامین ان کے دم سے شائع ہوئے تھے اور کئی اخبار ان کے دم سے چلے تھے۔

ان سے میری پہلی ملاقات کس طرح ہوئی وہ آپ بھی سن لیجئے۔ بہت

بفع زیادہ چھوڑ دیا وہ کیسے؟ تو میں نے استاد داراب خاں کا ورثہ پہاڑا منگایا
وہ بھی آپ سن لیجئے۔

شوگر کا ایک ڈنڈ یعنی سو بار گدر پھیر دتو، ایک ڈنڈ کے برابر ہے
یا اس سے ایک ڈنڈ کا طاقت آتا ہے پھر سینے۔

شوگر کا ایک ڈنڈ

شوگر کا ایک ترن

شوگر کی دانتھ

شوگر کا ایک گدن یعنی اکھڑا گونا

شوگر کی ایک اٹھن یعنی وزن اٹھانا

اور شوگر کی ایک دن

اس پہاڑے کو سن کر وہ بہت ہنسے مگر اتنی بات ضرور ہوئی کہ اس

روز سے خاں صاحب نے بھی ویٹ لفٹنگ شروع کر دی اور چند ہی روز کے بعد وہ

آٹا وزن اٹھانے لگے کہ میں بھی اُن سے پار مان گیا اور مقابلہ کرنے میں بھلیں،

جہاں تک لگا۔ یہ تو آپ نے اُن کی جسمانی ورزش اور پہلو ان کا ذکر سنا اب آپ

اُن کی دماغی ورزش اور ذہنی واڈس پیج کا حال بھی سن لیجئے پیج پوچھو تو اُن

کا دماغ اُن کے جسم سے بہت زیادہ طاقتور تھا اس میدان میں اُن کی پلٹ

پھرت اور واڈس پیج اتنے صاف اور منجھے ہوئے تھے کہ اُن کے دماغ نے

اُن کے جسم کو بچھاڑ دیا تھا اُن کا دماغ کیا تھا ایک نمائش گاہ تھی جس میں

ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی موجود تھی۔ جس کو جس چیز کا ضرورت ہوتی

اُسے فوراً وہاں مل جاتی تھی کتابوں کے تودہ کیڑے تھے چنانچہ ہر وقت مطالعہ

میں غرق رہتے تھے پھر نطفہ یہ ہے کہ صبح سے لیکر شام تک لوگ اُنہیں گھیرے

رہتے تھے۔ بعض بعض تو رات کو بھی اُن کا ہڈ نہیں چھوڑتے تھے جہاں معلوم

شعر کھلاتے تھے یا اُن کی اصلاح کراتے تھے یا اخباروں اور رسالوں کیلئے ایڈیٹوریل
تیار کراتے تھے بہر حال رات کے گیارہ بجے تک وہ برابر معروف رہتے تھے پھر
کمال یہ تھا کہ کوئی تازہ اخبار یا میگزین شائع ہوتا تو اُس میں اُن کا کوئی نہ کوئی
مضمون یا نظم ضرور ہوتی تھی۔

حیدر آباد میں تو شاید ہی کوئی شاعر یا انشا پرداز الیا ہوگا جو کچھ
لکھے اور اُنھیں آکر سنائے بیسوں اُن کے شاگرد تھے، بیسوں دوست تھے،
بیسوں گریڈ تھے اور بیسوں عاشق تادیدہ تھے اب بھی کئی لوگ اُن کا کلام،
گنگنائے رہتے ہیں۔ اور کئی صرف اُن کے نام ہی نام سے واقف ہیں۔ اور آگے
کچھ بھی نہیں جانتے شاید اس قسم کے اُن کے رنگ و روپ، حرکات و سکنات و تہیت
برخواست رنگ ڈھنگ، طرز تکلم اور اُن کے ڈیل ڈول کا اندازہ نہیں ہوگا۔
اس لئے پہلے الفاظ کے ذریعہ اُن کا نقشہ کھینچ دیتا ہوں تاکہ اُن کی شکل
و صورت کا اندازہ آپ کو بھی اچھی طرح سے ہو جائے اور اُن کا ناک نقشہ،
آپ کی آنکھوں کے سامنے ٹھہر جائے۔

خلاصہ حب اچھے پورے اور اونچے ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ قد کوئی
چھ فٹ کے قریب تھا کسرت کے شوقین تھے اس لیے جسم بنا ہوا تھا اور سڈول
تھا بھومی کش تھیں، غلافی آنکھیں، ستور ان ناک، دہانہ چوڑا سر پر ہلکے
بال، موچھیں چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی صفا چٹ رنگ انار کے دانہ کی طرح سرخ سفید
تھا اور چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا رہتا تھا عام طور پر تنگ ہری کا پانچامہ
اور میل کا سفید کرتا پہنتے تھے بس الیا معلوم ہوتا تھا کہ چنبیلی کے پھولوں کا،
ڈھیر پڑا سکرا رہا ہے۔ ادھر ادھر کتابوں کا انبار رہتا تھا ان میں ہر طرح کی
کتابیں تھیں تاریخ معاشیات، عمرانیات، ارضیات، حیاتیات، عرضہ کہ ہر فن
کی کتاب موجود تھی۔ جب کسی مسئلے پر بحث کرتے تو باتیں کرتے کرتے جس کتاب

جانتے آئیں بند کر کے نکال لیتے تھے اور جو بات زیر بحث ہوتی وہ عفو الہی
پر پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔

اکثر صبح کے وقت میں جاتا تو انھیں کچھ نہ کچھ پڑھتے ہوئے پاتا تھا دیکھتے
ہی مسکراتے اور کتاب الٹ کر منیر پر دھر دیتے تھے خدا معلوم یہ کیا بات تھی
یار لوگ تاک لگائے کھڑے رہتے یا پہلے سے کولہ پر و گرم بنالیتے تھے۔ چہاں
ایک آدمی کرسی پر اکر لیا اور پھر بیٹھ یا چال شروع ہوئی لوگ ایک کے بعد
ایک ٹپکنا شروع ہو جاتے ہیں کسی کے ہاتھ میں کتابیں رہتیں تو کسی کے بغل میں بستہ
کسی کے پاس اخبار کا نایل ہوتا کسی کے ہاتھ میں سارے کاغذ دیکھتے ہی دیکھتے پوری
کرسیاں بھر جاتیں۔ خاں صاحب کے بازو میں ایک چھوٹی سی منیر پڑی رہتی تھی اُس
پر درجنیا تمباکو کا ڈبہ، سگریٹ بنانے کا کاغذ اور دیاسلمائی کا ڈیہار کھی
رہتی تھی باتیں کرتے جاتے اصر ہاتھ سے سگریٹ بنانا کر خود بھی پیتے اور دوسروں
کو بھی پلاتے۔ انھیں خود معلوم تھا کہ آنے والوں میں کون کتنے پانی طلب ہے۔ اور
کون صاحب کرسی لیے تشریف لائے ہیں۔ چنانچہ ہر ایک سے نہایت خلقی و دردت
سے پیش آتے اور ہر ایک کے مرتبے اور حیثیت کے مطابق ہر تاؤ کرتے تھے
بس یہ سمجھ لو کہ ایک ادبی محفل تھی۔ جو صبح سے لے کر شام تک جی رہتی تھی۔
ان میں سے محض لوگ تو بڑھنے آتے تھے۔ بعض صلاح و مشورہ لینے آتے
تھے اور بعض کچھ بکھنے بکھانے اور سننے سنانے کیلئے آتے تھے۔ خاں صاحب
شیکسپیر کے تو عاشق تھے اُس کے ڈراموں کو وہ ایک ایک کر پڑھتے تھے کہ
بس وہ رجاتا تھا بڑھاتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا بہم رہا ہے
شکل سے شکل مقامات کو اس خوب سے سمجھاتے تھے کہ گویا شہرت کے
گھونٹ ہیں جو خلق سے اترتے چلے جا رہے ہیں۔ کہتے تھے کہ شیکسپیر ایک
عراقی شاعر اور ڈرامہ نویس ہے اس نے اپنے ڈراموں میں ایسے ایسے خیال بیکر

پیدا کیے ہیں جن میں سے حیاتِ انسانی کی چلتی پھرتی تصویریں ہماری نظروں میں گھومنے لگتی ہیں ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ اُس نے کوئی طبع زاد خیال پیش نہیں کیے ہیں بلکہ تاریخ اور نادلوں سے چند جوشیلے اور پھڑکے ہوئے قصے جن لیے میں اور ان میں نے کردار داخل کر کے اُن کو اصل سے بہتر بنا دیا ہے کہا کرتے تھے کہ اس کے ڈراموں میں ایک کمال یہ ہے کہ اگرچہ اُس نے اپنے زمانہ کے لوگوں کی زندگی اور خیالات ظاہر کیے ہیں مگر وہ آج سے تین سو سال گزر جانے پر بھی تمام دنیا کی دلچسپی کا موجب بنے ہوئے ہیں۔ یہ کیا بات ہے بات یہ ہے کہ شیکسپیر نے اپنے ڈراموں میں صرف دلچسپ قصے، اچھی اچھی تقریریں اور مفکرانہ چیز لطیف ہی نہیں لکھے ہیں بلکہ اصل نے وہ ذہنی کشمکش بھی ظاہر کیا ہے۔ جو دنیا کے ہر حصے اور ہر زمانہ کی عورتوں اور مردوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے اپنے ڈراموں میں نظم کے ایسے ایسے پیش ہوا جواہر تراش کے رکھ دیئے ہیں کہ کسی طرح دماغ سے محو نہیں کیے جاسکتے چنانچہ اس زمانہ سے اب تک جہذب ملکوں کے لوگ انھیں یاد کرتے ہیں اور موقع موقع سے دہرائتے رہتے ہیں ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہم لوگ مرچنٹس لف و سنس دے تیس ایسٹن کر رہے تھے ڈرامیک کلب کے جبریل نے کہا کہ مولوی غلامت اللہ خاں کو بھی اگر رپرسل میں بلائیں تو اچھا ہوگا۔ مگر انھیں لائیں کیے میں نے کہا کہ میں جاتا ہوں اور انھیں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ یقین مانئے دو پہر کا وقت تھا۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اُن کے گھر پہنچا کیا دیکھتا ہوں کہ آرام کرسی پر بیٹھے ہیں ایک ہاتھ میں کتاب ہے اور دوسرے ہاتھ میں حقے کا بیچوالا سرے لے کر کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اور گڑگڑ کر کے سانس کا دم بھر رہے ہیں مجھے دیکھتے ہی کتاب اُلٹ کر میز پر دھری رپرسل صوفیہ دیکھوں گا بس یہ کہہ کر اٹھے نوٹا کالے بالوں والی ٹوپی سر پر اڑھ، شیردان پہنی اور اپنی

مکڑی ہاتھ میں لے کر میرے ساتھ ہوئے۔ موقع پر پہنچے اور شروع سے آخر تک رہبر سل دیکھی پھر یار لوگوں کو بتا چلا کہ اُن کو شیکپیر کے ڈراموں پر کس قدر عبور حاصل ہے۔ یعنی الفا سے لے کر پورا کا پورا ڈرامہ اُن کی زبان پر تھا۔ جب کوئی اداکار رُکنا تو پر امر مقام ہی ڈھونڈتا رہتا۔ اور خان صاحب نے تقیم بھی دے دیتے اس کے علاوہ انھوں نے ہر ایک کو اسٹیج پر داخل ہونے کا

طریقہ ایک دوسرے سے بات چیت خود کلامی اور کانا پھوسا کرنے کا سلیقہ آنکھ اور چہرے سے خیالات اور جذبات کے اظہار کرنے کے ڈھنگ اور آواز کے آثار چٹھاؤ کے مختلف رنگا بتائے اور وہ وہ پڑھتے دین کہ ڈرامیک کلب کے پرلے اداکار جو، بچوں دینگے نبت کے چفکارے مارا کرتے تھے وہ بھی دم بخود ہو گئے اور اس دن سے خان صاحب کا دم بھرنے لگے۔

رہبر سل ختم ہونے کے چلے وقت ہمارے اسٹیج ڈائریکٹر نے اُنھیں وہ تقریر

سنائی جو ڈرامے کے ختم ہونے کے بعد پڑھنے کیلئے لکھی گئی تھی۔ خان صاحب نے فرمایا کہ بھی! اپنی تقریر کا رنگ بھی کچھ نہ والا ملتا جلتا رکھو۔ انھوں نے کہا کہ وہ تو بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔ خان صاحب نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ آپ بکھے اور، میں کھڑے کھڑے دو تین صفحے کی تقریر بھی نکھوا دی وہ تقریر اتنی دلچسپ پڑھنی اور ڈرامائی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ کئی دنوں تک اس کے چرچے رہے مقرر صاحب کی ہر جگہ تعریفیں ہوتی رہیں اور کسی کے خان صاحب کا نام تک نہیں لیا بلکہ خود خان صاحب کے آگے لوگ اُس ڈرامے اور اُس تقریر کی تعریفیں کرتے تھے۔ اور وہ بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملائے تھے مگر خدا کے بندہ کبھی یہ زبان سے بھی نہیں نکالا کہ یہ سب کچھ میرا ہی کیا کرایا تھا۔

اسی تقسیم کے آپ بیسویں قسط، مضمون اور تقریریں ملیں گی جنہیں شروع

سے آخر تک خان صاحب نے لکھی تھیں مگر اب وہ مالدار دوستوں کا ہو گیا

وہ تو خدا بخشے بھلا فرحت نے بھانڈا بھوڑ دیا اور پھر لوگوں کو پتا چلا کہ فلاں
مضمون خاں صاحب کا لکھا ہوا ہے اور فلاں ایڈیٹوریل نوٹ میرے سپاہی نے
خان صاحب نے اپنی قلم سے لکھا تھا۔

شعرو شاعری کے معاملہ میں بھی خاں صاحب سب سے جدا تھے وہ ایک
انقلابی شاعر تھے۔ پیمبر شاعری اور نظم مسلسل پر جان دیتے تھے غزل گوئی
کے بالکل قائل نہیں تھے۔ کہتے تھے کہ غزل کا میدان نہایت تنگ ہے ایک طرف
تو اس میں ردیف کا دم چلا لگا رہتا ہے۔ اور دوسری طرف خیالات کے
گلے میں تانیے کا پھندا پڑا رہتا ہے۔ شروع سے آخر تک پوری غزل دیکھ ڈالو
پس بے ربطی کا مجموعہ اور منتشر القیابی کا مرتبہ ہوتا ہے۔ ایک شعر میں ہدائی کا
رونا ہے دوسرے میں وصل کی خوشی ہے۔ تیسرے میں شراب ناب کے
مزے ہیں چوتھے میں شیخ جی پر پھتیاں ہیں پانچویں میں عدو کا رونا ہے۔
چھٹے میں قسمت کا گلہ ہے اور ساتویں میں ننگ کیج بزنار کا شکوہ ہے نہ تو اس
میں صداقت کا بومایا ہوتا ہے نہ واقعات کا سلسلہ قائم رہتا ہے نہ
اُس میں تخیلی پیکر پیدا کیے جاسکتے ہیں اور نہ اس میں معصومانہ شان
دکھائی جاسکتی ہے جو کہ شاعری کا بانی ہے۔

وہ ہمیشہ جدید طرز کی مسلسل نظمیں لکھتے تھے اور اپنے دوستوں کو،
مزے لے کر سنتے تھے جو کہ میٹھے اور سریلے بول، ہندیا بھروں میں ڈوبے
ہوئے حیات انسانی کی لہریں پیش کرتے ہیں اور سننے والے کی زبان سے
بے ساختہ آہ یا واہ نکلی جاتی تھی۔

نہ بھلا کہ تھی نہ بُرے کی تھی، مجھے کچھ چہلا کی خبر نہ تھی تمہیں عیش کا
ہی جو دھیان تھا، تمہیں میری چاہ اگر نہ تھی میرے حسن کیلئے کیوں مرے
نہیں لیتے تھے تمہیں یوں مرے۔

بہت چاہ جاتا، مرے دل کو موہ کے لے لیا
 مرے واسطے یہ بہشت تھی، تمہیں دلگی تھی یہ کھیل تھا
 مرے حسن کیلئے کیوں مرے! انہیں لینے تھے تمہیں یوں مرے

میرے حسن کی جو بیمار تھی مری کھل رہی تھی کلی، کلی
 یہ تمہیں پہ میں نے نثار کیا مرادیں لیا مری جان لی
 میرے حسن کیلئے کیوں مرے! انہیں لیتے تھے تمہیں یوں مرے

تمہیں چاہ رہا کہ جب ہوا میری وہ بہشت توجہ چکی
 مگر آرزو یہ ضرور تھی تمہیں دیکھ لیں کبھی کبھی
 میرے حسن کیلئے کیوں مرے! انہیں لینے تھے تمہیں یوں مرے

میرے دل سے ہو گا یہ کب بھلا، تمہیں دے سکوں کوئی بدعا
 وہ ہوا جو مانتے تھے پہ تھا نکھا میرے دل سے آٹے گا یہ صدا
 مرے حسن کیلئے کیوں مرے! انہیں لینے تھے تمہیں یوں مرے

خلا صاحب میں ہمدردی، محبت اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا
 پھر اُسی میں ایک بڑی خول یہ تھی کہ جس میں جو صلاحیت دیکھتے تھے تو اُسے
 اس طرح اُچھالتے تھے کہ جس سے اس کو بھی نایبہ ہو لوگوں کو بھی نایبہ،
 پہونچے اور علم و عمل کا دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جائے چنانچہ
 ایک صاحب کو لغت اور اصطلاحات ترقیب دینے پر لگایا دوسرے صاحب کو،
 مستعلیق نام پختہ میں بھساتا، تیسرے صاحب کو مزاجہ نگار بنا پر آمادہ،

کیا اور جیسے حد تک اُن لوگوں نے کامیابی اور دنیا میں شہرت حاصل کی، وہ اُن کی
کوششوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

اب میری سنیں! مجھے مصوری سے کچھ لگاؤ تھا۔ ایک مرتبہ میں غالب
کی تصویر بنا رہا تھا آج خدا خدا کر کے وہ ختم ہوئی۔ اب اُسے میں دیکھوں گا
تم دیکھو گے اور تمہارے دو چار احباب دیکھ لیں گے اس کے بعد یہ کسی ڈرائنگ
روم کی زینت بن کر رہ جائے گی۔ میں نے کہا کہ اس سے زیادہ آپ کیا چاہتے ہیں
کہنے لگے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اسے حیدر آباد نہیں ہندوستان بلکہ تمام دنیا
دیکھے میں نے کہا کہ وہ کس طرح، تو کہنے لگے وہ اس طرح کہ تم نے اس تصویر کا ہاں
ٹون یا رنگین بلاک بناؤ اور پھر اس سے تم غالب کی ہزاروں تصویریں بچاؤ سکتے
ہو۔ اس سے تمہیں بھی فائدہ ہوگا لوگوں کو بھی فائدہ ہوگا اور غالب کی تصویر
گھر گھر پہنچ جائیگی۔ میں نے کہا کہ خان صاحب! میں ہاں ٹون بلاک بنانا نہیں
جانتا۔ کہنے لگے ارے میاں! وہ تو نہایت آسان چیز ہے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھے
اور الماری میں سے ایک کتاب نکال لائے۔ اس پر لکھا تھا ہاں ٹون بلاک
”خان صاحب“ اس کتاب کے ورق اُلٹ اُلٹ کر تصویریں اور بلاک بنانے
کی ترکیبیں بتاتے رہے۔

آخر میں وہ کتاب مجھے دے کر کہنے لگے، ”اسے تم نے لیا اور ذرا
کوشش کر کے ایک بلاک تو بناؤ وہ کتاب اب تک میرے پاس ہے میں
نے اُن کی پڑائیوں کے مطابق بلاک بنایا اُس کے بعد مجھے اُس فن سے اتنی
دلچسپی ہو گئی کہ بعد میں میں نے کوشش کر کے بلاک سازی کا تعلیم پائی اور اس کے

۱۔ یہ اشارہ عبد الحق صاحب کی جانب ہے۔ ۲۔ موسیٰ رفیق بیگ صاحب کو اردو ٹاپ گلاب
مائل کیا تھا۔ ۳۔ مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کو طراقت کے میدان میں لاکھڑا کیا۔

بعد سے اب تک میں اُسی پھیر میں پڑا ہوں ۔

مختصر یہ ہے کہ عظمت اللہ خاں مرحوم الہی خوبیوں کے آدمی تھے
اور ان کی دلچسپیاں اتنی وسیع تھیں اور ان کے معلومات اس قدر بلند
تھے کہ جو شخص بھی اُن سے ملتا تھا ۔ اُس کے رجحانات ، صلاحیت اور
قابلیت کے لحاظ سے اُسے لیے راستے پر لگا دیتے تھے کہ وہ اپنی زندگی میں
اُس رستے پر چل نکلے اور کامیاب بن کر منزل حاصل کر لیتا تھا ۔
خدا بخشنے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

(اخبار سیاست سے ماخوذ کیا گیا)

فرحت کی زندگی کے چند پہلو

مرزا فرحت اللہ بیگ کے نام سے ہندوستان کا تقریباً ہر چھوٹا بڑا واقف ہے اور جن لوگوں نے اُن کے مضامین پڑھے ہیں وہ غالباً اُن کے شجرے سے بھی واقف ہوں گے اس لیے کہ بعض مضمون ایسے بھی ہیں جن میں بڑی تفصیل سے وہ اپنے فائدہ لائق حالات بیان کر گئے ہیں۔ وہ ترکی نثر ادا تھے۔ ڈیل ڈ دل اور صورت شکل بھی مغلوں کی سی تھی اور آنکھیں بھی مغلوں کی طرح چھوٹی چھوٹی چیاں جیسی تھیں، مگر نقاب کا طرح تیز اور اُنظر طاثر کی طرح روشن مغلوں کا قاعدہ تھا کہ نفع حاصل کرنے کے بعد وہ دشمنوں کے کاسٹھ سر میں شراب پیتے تھے اس رسم کو انہوں نے اپنے ایک شعر میں بڑی خوب سے ادا کیا ہے۔

میں کچھ نہ سہی فرحت اُس قوم کا ہوں لیکن

غفوروں کے سر جس نے چھلانے بنا ڈالے

غالب، خواجہ میر درد اور مومن خاں سے قرابت تھی اور خواجہ بدر الدین خاں

مترجم بوستانِ خیال اور سعادت یار خاں رنگین سے رشتہ داری تھی۔ چنانچہ ایک

جگہ لکھتے ہیں کہ

بواہِ ریختی نکلی ہے ان ہی کے گھرانے سے

سنا ہوگا میاں رنگین سے جو رشتہ ہے فرحت کا

مروجہ ہمیشہ کہتے تھے کہ میں خالی کے حینے میں پیدا ہوا تھا۔ مگر نہ تو کبھی،

اللہ نے یہ توفیق دی کہ اُن کی پیدائش کا سنم جو چھتے اور نہ کبھی انہوں نے بتایا۔

خدا عزوجل غلام یزدانی صاحب کو خوش رکھے۔ انھیں سنہ اور تار یخیں تباہ کرنے میں کمال حاصل ہے اور کیوں نہ ہو۔ بچپن سے وہ اسی فن میں بڑے ہوئے ہرے مردے قبروں سے اکھاڑتے ہیں اور پڑانے سے پڑانے باوا آدم کے زمانے کے مقبروں اور گنبدوں کا سنہ تعمیر تباہ دیتے ہیں پھر بھلا مرحوم کا سنہ پیدائش تباہ دنیا ان کیلئے کیا مشکل تھا۔ بچپن کے ساتھی ہیں، میں نے پوچھا تو انہوں نے فوراً اپنی لال کتاب اٹھائی اور پوچھی لا کر بتایا کہ مرحوم ۱۸۸۴ء کے اوائل میں پیدا ہوئے تھے، لیجئے اس حساب سے اُن کی عمر کوئلہ ۶۲ سال کا ہوتی ہے۔

بھائی فرحت دہلی میں پیدا ہوئے تھے، وہیں تعلیم و تربیت پائی، وہیں ایم۔ اے میں پڑھا اور وہیں چھوٹے سے بڑے ہوئے، اس کے بعد حیدرآباد آ گئے۔ یہاں آ کر ملازم ہوئے یہیں شادی ہوئی۔ یہیں پنشن ہوئی اور یہیں انتقال کیا، اور یہیں الہی چمکی کی خاموش فضا میں آرام سے سو رہے ہیں۔ انھیں حیدرآباد سے بہت محبت تھی، مگر شعر و شاعری اور لکھنے پڑھنے کے معاملے میں ہمیشہ بڑے فخر سے بولتے تھے کہ میاں! میں خالص دہلی کی زبان لکھتا ہوں! جہاں کہیں موقع ملتا دہلی کا ذکر خیر کر دیتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

غزل سن کر مزا آجاتا ہے دلی کی اردو کا
خدا اچھا رکھے واللہ کیا کہنا ہے فرحت کا

مرحوم ہر فن مولا تھے۔ مقصودی کا انھیں شوق تھا اور مضمون نگاری اور شعرو شاعری سے انھیں دلچسپی تھی۔ پھر کمال یہ ہے کہ جس فن میں ہاتھ ڈالا، اُسے اس خوبی سے کر دکھایا کہ بڑے بڑے استاد بھی اُن کا لوہا مان گئے۔

مرحوم کو ڈراما نویس اور اداکاری سے قدرتی لگاؤ تھا۔ قسمت سے انگلستان کا ایک مشہور اداکار ہمننگ نامی پھرتا پھرتا دہلی آ گیا تھا۔ یہ بھلا کہاں جو کئے والے تھے فوراً اپنے اور اُس کے شاگرد ہو گئے اور اس سے مدتوں اداکاری سیکھی۔ حاکم بلا کا پایا تھا، جو چیر پڑھتے فوراً یاد ہو جاتی۔ اپنے پارٹ کے ساتھ دوسروں کے پارٹ

بھی نوک زبان رہتے تھے شیمپکیر کے کئی ڈرامے حفظ تھے، ہنری دی ففٹی میں، شاہ ہنری کا پارٹ اور مرچنٹ آف وینس میں شاملاک کا پارٹ، خوب کہتے تھے۔ ہاتھوں کی نئی تلی حرکات، آنکھوں کے اشارے اور آواز کا اتار چڑھاؤ، جذبات کے جزو مد کو ابھارتا رہتا تھا۔ آواز میں خاص قسم کی کشش تھی، جب کڑاں کر بولتے، تو معلوم ہوتا کہ تڑم نکال رہا ہے۔

بھائی فرحت اپنی تعلیم ختم کر کے ۱۹۰۰ء میں دہلی سے سیدھے حیدر آباد آئے۔ یہاں اللہ کے بعض رشتے دار جیسے نواب سرور الملک بہادر، نواب سر بلند جنگ، مولوی عزیز میرزا صاحب، مرزا خداداد بیگ، مرزا ساجد بیگ اور مرزا واجد بیگ وغیرہ، بڑی بڑی خدمتوں پر مامور تھے۔ مولوی عزیز مرزا ہوم سیکریٹری تھے۔ شاید یہ دیکھنے کیلئے کہ دیکھیں ہمارا یہ نوجوان رشتہ دار کتنے پانی میں ہے، فوراً ان کا تقرر گورنمنٹ ہائی اسکول پادرگھاٹ کی مددکاری پر کر دیا۔ مرحوم مدرسہ کی زندگی سے تو فوٹو، واقف تھے، علمی قابلیت تھی، ہنس مکھ اور ظریفانہ طبیعت تھی، کھیل کود، کشتی اور جمناٹک میں طاق تھے اور کرکٹ وغیرہ کھیلنے میں مشاق تھے۔ انہوں نے آتے ہی وہ دلچسپیوں کے سامان بہم پہنچائے کہ چند روز ہی میں تمام طالب علموں کو اپنا گردیدہ کر لیا۔ مختصر یہ ہے کہ یہاں آکر مرزا صاحب کو جوش آیا اور پہلی مرتبہ گورنمنٹ اسکول میں انھوں نے ڈرامہ کیا۔ وہ ڈرامہ کیا تھا، چوں چوں کا ٹرپہ تھا، اس میں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے الفاظ شامل تھے، مگر اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے اس ڈرامے میں حصہ لیا تھا اب تک اسی کاراگ الاپتے رہتے رہے اور جو ماشائی اُس وقت موجود تھے اور اس وقت بہ قیصریات ہیں۔ اب تک اُس کی یاد سے لطف اُٹھاتے رہتے ہیں۔ میرزا فرحت اللہ بیگ مدرسہ میں زیادہ نہیں ٹیکے۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہی وہ مترجمی کی خدمت پر عدالت العالیہ میں منتقل ہو گئے، مگر وہ اپنے طالب علموں میں ایک ایسا جذبہ چھوڑ گئے تھے جو اب تک اللہ کے دلوں کو گرم رہا ہے۔

چنانچہ بعض طالب علم تو ایسے ثابت قدم ثابت ہوئے، کہ جب انھیں جوشی بہا تو بغیر
 ہلٹی ٹیم دیئے ہوئے نازل ہو جاتے اور اپنا سبق ڈہرا کر چل دیتے تھے۔ ان میں سے
 ایک صاحب کا نام تو ضرور بتاؤں گا، حسین علی مرزا، آج کل عثمانیہ یونیورسٹی میں قانون کے
 پروفیسر ہیں۔ یہ اسکول ڈرامیٹک کلب کی روح رواں اور فنانس ڈراما تھے۔ اگر
 خدا نخواستہ دو چار ہفتے تک کہیں ڈراما نہ ہو تو ان کے پیٹ میں چوبے دوڑتے رہتے
 تھے۔ فوراً ایک نیا ڈراما لکھا جاتا، پارٹ تقسیم ہوتے، ریہرسل ہوتا، بھائی فرحت
 کے ہائیڈ ڈھرایا جاتا، جب وہ پاس کر دیتے تو مدرسہ میں ایجنج کرتے تھے، یا یار دوستوں
 کو دعوت دے کر وہ خود اپنے گھر میں ڈراما کر ڈالتے تھے۔ ان کے علاوہ باقی اور
 ہی حالی موالی ہیں۔ جواب بڑھے مرنے کو آئے مگر ڈرامے کے جراثیم اب بھی ان کے
 تن بدن میں میڈک کی طرح پھدکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہاں تو میں بھائی فرحت کے متعلق کہہ رہا تھا کہ وہ انگریزی ڈراما خوب
 کرتے تھے، مگر یہ انگریزی ڈرامے مدرسہ اور کالج کا حد تک تھے۔ اصلی شوق تو انھیں
 اردو ڈراموں سے تھا۔ کہا کرتے تھے کہ یورپ میں جو ڈرامے کا معیار ٹائم ہو چکا ہے
 اس کی پہچنے میں ہمیں مدد تیں چاہییں۔ میاں! ہم تو بہ قول شمعے ڈرامے کی دم بھی نہیں
 جانتے۔ مگر آغا حشر سے ان کا پڑانا یا رانا تھا، وہ ہمیشہ تعریف کیا کرتے
 تھے، کہتے تھے کہ اس کے مرنے سے اردو ادب کا ایک پہلو بالکل تاریک ہو گیا۔^{۱۳۵}
 میں آغا حشر کا انتقال ہوا۔ مرحوم نے تاریخ کہا تھی وہ بھی سن لیجئے۔

حشر کے مرگ ناگہانی پر	دوستوں کی عجیب حالت ہے
کر دیا غم سے مجھ کو پرشردہ	یوں تو کہنے کو نام فرحت ہے
سوچتا تھا کہ اب کسی میں بھی	جانشینی کی قابلیت ہے

جب نہ نعم البدل رہا تو کس
 حشر کی موت اک قیامت ہے

وہ ڈراما دیکھتے اور خوب ٹھوک بجا کر دیکھتے پھر فوراً اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتے۔
 دوسرے روز اُس پر ایک چٹ پٹا سا نوٹ لکھ کر اخبار چوپچ یا کسی دوسرے فلمی ریلے
 میں بھیج دیتے۔ وہ ڈرامے میں کیا دیکھتے تھے؟ میں بتاؤں، بس گنتی کی تین چار باتیں تھیں
 وہ اگر ٹھیک ہیں تو ڈراما بھی ٹھیک ہے ورنہ پیسے ڈنڈ اور ڈراما بے کار، پہلے تو وہ
 دیکھتے تھے کہ ہر ایک کردار برابر اپنے مقررہ راستے پر چل رہا ہے یا نہیں جہاں وہ رہتے
 سے جھٹکا اور اُنھوں نے وہیں ٹوکا کہ وہ لا حول ولا اُسے میاں یہ بات اس کے منہ سے
 کھلانے کی نہیں تھی، میرے یار نے کیا اتنا پشیمان ڈرامہ لکھ مارا ہے، پھر تاریخی
 پس منظر اور ماحول کو دیکھتے تھے۔ پھر یہ کہتے تھے کہ ڈرامے میں جو تھے وہ ان کی کردیاں
 آپس میں ایک دوسرے سے اچھی طرح ملی ہوئی ہیں یا نہیں۔ جہاں اُس میں کوئی کمزوری دیکھی
 اور ٹھوک دینے شروع کر دیئے کہ اُسے میاں! یہ تو دو ڈرامے ہو گئے۔ دوسرے صاحب
 کو سہ وہ کیا سمجھیں کہ فیکری ڈالنا ہے اور کیا نکالتا ہے فوراً کہہ دیتے کہ نہیں
 بھائی یہ تو وہی ڈراما ہے۔ دوسرا کہاں سے آجائے گا، یہ کہتے کہ میاں! تم نے خیال
 نہیں کیا، ظالم نے اصل ڈرامے سے اس قہقہے کا ربط ہی نہیں رکھا ہے۔ تیسرے یہ
 چیز دیکھتے تھے کہ ڈراما دریا کی طرح بہتا چلا جائے اور ساتھ ہی ساتھ سین سینریاں
 آسانی سے بدلتی چلی جائیں۔ جہاں ڈرامے میں اس قسم کی کوئی رکاوٹ یا کمزوری دیکھتے
 تو کہتے تھے کہ چلو بھائی ذرا باہر چکر لگائیں، اب یہ ظالم اپنا سین بدلنے کیلئے پندرہ
 بیس منٹ تک کھٹ پٹا کرتا رہے گا۔

اردو ڈراموں کی اصلاح اور ترقی کیلئے حیدر آباد میں بھی کئی انجمنیں
 کھولی گئیں۔ ان میں ہماری انجمن، انجمن ترقی ڈراما بھی تھی۔ مولوی فضل الرحمن صاحب

اس کے بانی مہلاتا تھے۔ ایک دفعہ مولوی فضل الرحمن صاحب کا لکھا ہوا ڈراما،
 ”ظاہر باطن“ دکھایا جا رہا تھا ”حاضرین والا تکلیف“ کا وہ زور کہ ”معاذ اللہ“
 ریلی دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بہ قول شخصے تعالیٰ پھینکتے تو سروں پر جاتی اور رانی پھڑکتے

تو فرحت نے آتی۔ بھائی فرحت بھی اگلی صفا میں ڈٹے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے اور
 ان کے دونوں بڑے کے مرزا رفعت اللہ بیگ اور مرزا شرافت اللہ بیگ بڑے زور شور
 سے پارٹ کر رہے تھے۔ ڈراما نہایت لا جواب تھا۔ رفعت اللہ بیگ اور شرافت اللہ بیگ
 دونوں کے دونوں اداکاری کا حق ادا کر رہے تھے اور مرزا صاحب دیکھ دیکھ کر خوش
 ہوتے اور چوہے نہیں سہاتے تھے۔ کبھی پلاٹ کی تعریف کرتے تھے تو کبھی زبان کی
 کبھی کرداروں کی تعریف کرتے تھے تو کبھی میک اپ کی۔ اب سینے دوسرے ڈرامے کا
 پہلا سین ڈیپ تھا اور اتفاق دیکھئے کہ دوسرا سین بھی ڈیپ آ پڑا۔ بھلا مرزا صاحب
 یہ کہاں دیکھ سکتے تھے، فوراً ایک صاحب کو پوچھا کہ دے کر بولے کہ لیجئے یہاں آکر آپ کا
 ڈراما بھی قلابازی کھا گی۔ دوسرا تو کوئی بھی اس قلابازی کو نہ سمجھا، مگر یہ آخر تک برابر
 قلابازی کھاتا رہا۔ ڈراما ختم ہونے کے بعد گھر پہنچے راتوں رات ایک اسٹریٹ سین
 نکھا اور دوسرے روز انجمن کے مقدمہ صاحب کو بھیج دیا۔ واقعی مرزا صاحب نے ڈکھتی
 رگ پکڑی تھی اور یہ کمزوری ضرور تھی۔ چند روز کے بعد پھر وہی ڈراما دکھایا گیا جس
 میں ان کا لکھا ہوا سین شریک تھا مرزا صاحب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ایک صاحب
 نے کہا کہ واہ استاد کمال کیا، کیا ڈانڈے سے ڈانڈا ملایا ہے بولے دیکھ لیجئے، جاؤ
 استاد خالی است۔

بھائی فرحت نے بھی کئی ڈرامے نکھے۔ ایک خاموش فلم کیلئے 'مزاحیہ ڈراما'
 نکھا تھا اس میں بالکل چارلی چپلن کا مذاق اڑایا تھا۔ اگر وہ ہندوستان میں ہوتا
 تو بس مرزا آجاتا۔

دوسرا بولتی فلم کیلئے نکھا تھا۔ علاء الدین ایسے اہل قلم نے بھی بہت پسند
 کیا اس ڈرامے کو فلمانے کیلئے ایک صاحب بمبئی سے بات چیت کرنے کیلئے آئے اور
 انہیں میں کچھ رد و بدل کرنے کی اجازت چاہی۔ کہنے لگے کہ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ
 اس میں رد و بدل کرنا چھوڑ دوں۔ کہنے لگے کہ آپ کوئی فکر نہ کیجئے، وہ ہم اپنے مکالمہ نویس

سے درست کرالیں گے۔ بولے کہ جناب! یہ مدت کرانے کے کیا معنی، میں آپ سے صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ اگر کسی نے اس کا ایک حرف بھی ادھر سے ادھر کیا، تو پھر میں اس کی جان کو آجاؤں گا اور گلا گھوٹ دوں گا۔ اس نے کہا یہ کام بغیر آپ کے مشورے کے نہیں ہوگا۔ کہنے لگے کہ آپ میرے حل پر رحم فرمائیے، میں ایسے نکلانے سے باز آیا۔ جس میں آپ خوش بھی خامہ فرسائی کرنے کا زحمت گوارا فرمائیں۔ ارے میاں! کٹ چھٹ، پھر تودہ ڈراما من چہ می سرایم زبورہ چہ می سراید، کامیاب ہو جائے گا۔ اس کے بعد تیسرا ڈراما ختم ہوا اور ادھر ہماری انجمن کیلئے دو چھان بہادر، نکھاتھا مگر عجیب بات یہ ہوں کہ ادھر وہ ڈراما ختم ہوا اور ادھر ہماری انجمن بھی ختم ہو گئی۔ انجمن کے بانی لاسلکی کے ناظم ہو گئے، منتظین اور ڈاکٹر کراک الگ نوکر یوں سے جا چکے، اور اداکار الگ اپنے اپنے دھندوں سے جا لگے۔ غرض یہ کہ سب طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر اڑ گئے اور اس مصنوعی ایجنسی سے منہ موڑ کر دنیا کے حقیقی ایجنسی پر اپنے اپنے پارٹ ادا کرنے میں جٹ گئے۔

اب ان کی معشوری کا بھی کچھ حال سن لیجئے۔ انہیں معشوری اور نقشہ کشی کا بہت شوق تھا۔ دہلی کے مشہور و معروف معشور استاد عارف کے شاگرد بھی تھے مگر یہ یاد رہے کہ ہماری آج کی معشوری اور مرحوم کی معشوری میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہم آج کل کے رنگ پر چلتے ہیں اور وہ پرانے رنگ پر چلتے تھے۔ ہم چہرے پر لالیلے دھبے مار کر جھوٹ دیتے ہیں۔ اور وہ چہرے کے گرد بڑی احتیاط سے خط کھینچ کر رنگ آمیزی کرتے اور خاص خاص طریقوں سے رنگ بھرتے تھے۔ ہم بالوں پر کوئی بھی مناسب گہرا رنگ مار کر جھوٹ دیتے ہیں۔ مگر وہ نقل مطابق اصل کے اصول پر چلتے اور رنگ میں رنگ ملا کر وہ بال کی کھال نکالتے کہ کوئی چاہے تو ایک ایک بال گن لے مختصر یہ ہے کہ وہ بڑی محنت اور جاں نشانی سے تصویریں بناتے تھے۔ انہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

بہر حال وہ پچھلے زمانے کے معشوروں کے قایل تھے۔ اور پرانے معشوروں

پر دل و جان سے شیدا تھے۔ یہاں تک کہ وہ آج کی کے برشوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتے تھے۔ جہاں کسی موٹی تازی گھری کو دیکھتے تو منہ میں پانی بھر آتا، فوراً کہتے کہ میاں! لپک ذرا اس کی دم تو توڑ لا، میں اور رحمت بھائی گھریوں کی دم کے پیچھے پڑے رہتے۔ بڑی بڑی ترکیبوں سے ان کو پکڑنے اور دھیس توڑ توڑ کر ان کی خدمت میں پیش کرتے

رہتے پھر وہ اس کا برش بنا کر رنگ آمیزی کرتے تھے کبھی کبھار رنگ بھرنے کیلئے اس ان کا برش لینے کیلئے ہاتھ بڑھاتا تو فوراً ٹوکتے اور میرا ہاتھ روک کر کہتے کہ بس، حجاب میرے برشوں پر رحم فرمائیے، یہ رنگ بھرنے کے ہیں تھوپنے کیلئے نہیں ہیں۔

تعلیمات سے عدالتِ عالیہ میں منتقل ہونے کے بعد کوئی دو سال تک معشوری کا زور رہا، اس کے بعد وہ ناظم ہو گئے، پھر تو ہاتھ پاؤں جھاڑ کر مقدموں کے پیچھے پڑ گئے اور رات دن فیصلوں پر فیصلے گھسیٹتے رہتے تھے۔ ان کی ثروت

پھرت کاروائیوں اور تین فیصلوں سے دکیل خوش، بدعی سست اور اہلِ معاملہ چست ہو گئے تھے۔ مقدمہ بازی کا گرم بازاری سے تمام مشغلے ٹھنڈے ہو گئے تھے، بس میاں نویں

وی نویں، دی نویں کا زور تھا جب کوئی کسی مقدمے کی سفارش کرنے آتا، تو کہتے تھے

کہ بڑی دیر کی چہر ہاں آتے آتے ارے میاں اب کیا سرے سرے کو اکھاڑ رہے ہو اس مقدمے کا فیصلہ کر کے تو بدلتی ہوئیں، زمانہ ہو گیا وہ پوچھتا کہ آخر فیصلہ کیا کیا ہے؟ تو کہتے کہ کلی تم خود دفتر میں جا کر دیکھ لو، سب کچھ مشل میں موجود ہے اور یہ

یقین جانو کہ کوئی بات رویدادِ مشل کے خلاف نہیں ہے۔

بہر حال معشوری کو خیر باد کر دیا، جو نقشا و نگار کھلی تھے وہ فریم کر کے

لٹکا دیئے گئے جو نامکمل تھے یا رنگ ہاتھوں ہاتھ لے اڑے رنگ، برش اور کاغذ

وغیرہ کچھ تو یہ کہہ کر مجھے دے دیئے کہ یہ بخشد، بروے دل شہر یار اور بچے کچے

رحمت بھائی کے حوالے کر دیئے۔

بھائی فرحت کو کتب بینی کا بہت شوق تھا۔ ہراج خانوں سے، کپڑوں کی دکانوں سے یا کتب فروشوں سے جب کوئی مزیدار کتاب مل جاتی تھی تو پھر تمام پروگرام منسوخ کر دیتے، یہاں تک کہ کھانا بھی برابر نہیں کھاتے تھے۔ چائے پیتے وقت ایک ہاتھ میں چائے رہتی تو دوسرے ہاتھ میں کتاب، کھانا کھاتے تو نوالہ منہ میں رہتا اور آنکھیں، کتاب پر جمی رہتی تھیں۔

مرحوم اُس زمانے میں کبھی کبھار ایک دو مضمون بھی لکھ مارتے تھے، مگر ایسے مضمون کبھی اپنے نام سے نہیں چھپواتے تھے اور مجھے سنت تعجب ہوتا تھا، جب کہ اُن مضمونوں کے ساتھ اپنا نام چھپا ہوا دیکھتا تھا۔ بعض اوقات مجھے ایسے خط بھی وصول ہوتے تھے، جن میں اُن مضمونوں کا تحریف ہوتی تھی۔ اور اسی قسم کے مضامین روانہ کرنے کا نرمالیش بھی ک جاتی تھی۔ اگت آپ ”الحجاب“ بھوپال کے رسالے دیکھیں تو اُس میں قلمی بھی مضمون چھپے ہیں۔ وہ سب میرے ہی نام سے منسوب ہیں۔ رسالہ ”نمائش حیدر آباد دکن میں جو مضامین میرے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ اُن کی بھی ہی کیفیت ہے۔ اسی طرح رسالہ ”انادہ“ حیدر آباد میں ”ہم اور ہمارا امتحان“ کے دونوں حصے میرے ہی نام سے چھاپے گئے ہیں وہ بھی مرحوم کے ہی لکھے ہوئے ہیں۔ مجھے بھی مزاحیہ مضمون لکھنے کا شوق تھا۔ اور ہم بھی اپنے آپ کو بُرا، ظریف سمجھتے تھے ایک دن میرا مضمون سن کر کہنے لگے کہ ارے میاں! ظریف کے معنی پسوڑے، مسخرے یا وہ گو اور بھانڈے کے تو ہیں نہیں، ظرافت تو خوش طبعی اور، ذہانت کا نام ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ہماری حقائق اور عیوب دلکش طریقے سے بتائے جائیں اور سیاسی، سماجی اور ملکی اصلاح، دلچسپ طریقے سے کی جائے۔ ظرافت میں تو مذاق شستہ، پاکیزہ اور صاف ستھرا ہونا چاہیے، تم تو بھانڈوں کی ظرافت کے میدان میں اُتر آتے ہو۔ کبھی اپنا پیٹ پھلاتے ہو کبھی پچکاتے ہو اور نیم پر ہنر ہو کر تھرکنے لگتے ہو، اگر تمہاری یہی ظرافت ہے تو ایسی ظرافت کو ہمارا دور سے

سلام ہے۔

میں کہتا تھا کہ بھئی! یہ نئے قسم کی ظرافت ہے کہ اُردو بھی سلیں اور بامی ساروہ ہو، میدانِ سخن میں فصاحت کا گھوڑا بھی دوڑتا رہے کسی کی توہین بھی نہ کا جائے، رکیک اور سوتیلیا نہ الفاظ بھی نہ آئیں، خواہ مخواہ لطیفے اور چٹکے بھی نہ ٹھونسے جائیں اُلتی سیدھی اور سہلے کی باتیں بھی نہ کا جائے تو پھر بھلا سیدھی سادی باتوں میں ظرافت کہہ کر سے آجائے گی۔ اور اس قسم کی باتیں سن کر لوگوں کو کس طرح ہنسی آجائے گی۔ مگر بھلا فرحت برابر ہی کہتے تھے کہ بڑا کمالی تو یہی ہے کہ واقعات سے مذاق پیدا کیا جائے اور واقعات کو اس انداز میں بیان کیا جائے کہ پڑھنے والوں کو گدگداتے رہیں اور اُس کے دل و دماغ پر ایک انبساطی کیفیت پیدا کرتے رہیں وہ کہتے تھے کہ مثلاً تم کسی بنیاد کے آدمی کے حالات بیان کرو، پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اُسے پڑھ کر کون خوش ہوتا ہے ارے میاں! جب تم اُن کا وضع قطع اور صورتِ شکی دیکھ کر ہنس پڑتے ہو تو پھر اُن کے تحریری طے اور واقعات کی تصویریں دیکھ کر نہ ہنسنے کے کیا معنی ہیں۔ اب سنئے! اس عرصے میں میرے استاد حکیم معشوق علی خاں جوہر کا انتقال ہو گیا۔ حکیم صاحب ہر فن میں استاد تھے سخن، سنج، سخن فہم، ظریف، الطبع، حکیم، وکیل، غرض کہ ہر فن مولانا تھا۔ جس محفل میں بیٹھتے بیل ہزار داستان کا طرح چمکتے رہتے تھے۔ بدیہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ قیعدے کے قیعدے ایک ہی میٹھک میں لکھ دیتے تھے۔ اُنہیں مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم، بھوپال سے اپنے ساتھ حیدرآباد لائے تھے اور اُنہیں بہت عزیز رکھتے تھے بہر حال اُن کا انتقال ہوا۔ مولوی سجاد مرزا صاحب (مقدمہ تعلیمات) اُن کا بڑا آدمی جگت کرتے تھے اور حکیم جی بھی انہیں بڑی محبت اور عزت کا نگاہوں سے دیکھتے۔ ایک دن، سجاد مرزا صاحب بیٹھے بیٹھے مجھ سے کہنے لگے کہ ارے میاں! حکیم جی کے حالات لکھ ڈالو، مگر خشک اور روکھے پھیکے رنگ میں نہیں، بلکہ جس طرح وہ،

خوش بیاں، خوش دماغ، خوش زبان، خوش نگر، خوش سخن، خوش گفتار اور نازک
 مزاج تھے، بس اسی خوش اسلوبی اور نزاکت سے تم بھی اُن کا تصویر کھینچ ڈالو،
 اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مجھے دو چار انگریزی کتابیں بھی دیں اور کہا کہ پہلے انہیں
 اچھی طرح گھونٹ ڈالو اور پھر اسی رنگ میں ان کے حالات بیان کر جاؤ۔ میں اُن کے
 حالات لکھنے میں جُٹ گیا اور جب وہ مضمون ختم ہوا تو پھر بھائی فرحت کو جا کر سنایا
 انہوں نے اسے بہت پسند کیا مگر کہنے لگے کہ اس میں اب بھی ضلع جگت کی بھرمار ہے۔ اور
 علی چاشنی کی کمی ہے۔ میں نے کہا کہ خیر، ضلع جگت کے معاملے میں بندہ لاچار ہے۔
 مگر علی چاشنی کا فرمایہ کہ وہ کہاں سے لاؤں کہنے لگے کہ یہ چاشنی گڑا گاؤں میں نہیں
 ملے گی، اس کیلئے تو استاد کی چلیں بھرنی پڑتی ہیں۔ اچھا جمعرات کی شام کو آ، میں
 تجھے لکھنے کا ترکیب بتاؤں گا۔ میں اس روز شام کے وقت یونہی گیا تو کیا دیکھتا ہوں
 کہ تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں سامنے لیمپ جل رہا ہے ایک طرف چھوٹا سا صندوق
 رکھا ہوا ہے، دوسری طرف بہت سے کاغذ بکھرے پڑے ہیں اور خود بڑے
 بڑے زور و زور پر لکھنے میں مصروف ہیں۔ میں نے پوچھا کہ بھائی کیا کچھ رہے
 ہو؟ کہنے لگے کہ سامنے آکر خاموش بیٹھ، اس دقت میں ڈاکٹر نذیر احمد کی بھائی
 کھ رہا ہوں۔ میں نے ایک صفحہ اٹھا کر پڑھا تو کہنے لگے، میاں! کیا پڑھتا ہے
 بس میں نے تو قلم توڑ دیا ہے اس دقت میں نے دیکھا کہ کہانی انہیں حفظ ہے
 اور یہ اُسے قلمبند کرتے چلے جا رہے ہیں۔ جب یہ مضمون شائع ہوا تو ہر طرف سے
 تعریف و تحسین کا شور بلند ہو گیا۔ مولوی عبدالحق صاحب اور مولوی غلام یزدانی صاحب
 نے دل کھول کر داد دی اور عظمت اللہ خاں مرحوم، سراج یار جنگ اور عنایت
 اللہ خاں مرحوم نے تو تعریف کے پلے بانڈ دیئے۔

فرحت اللہ بیگ کا تیسرا شاہکار دو دہلی کا مشاعرہ ہے مولوی عبدالحق صاحب
 نے اورنگ آباد کالج ڈسے کے موقع پر اس مشاعرے کو اشیع کیا تھا۔ بھائی

فرحت ایسی بڑی ڈالر کر گئی تھی، یعنی اس مشاعرے کے تمام انتظامات اُن کے سپرد تھے۔ میں نے اُس ڈرامے میں غالب کا پارٹ کیا تھا۔ غالب کی ڈارٹھی، موجد، بھالہ، فرحت نے بنائی تھی۔ کلاہ پاپاخ بھی انھوں نے ہی تیار کی تھی۔ ایک برکاریشمی پاجامہ ہاتھ سے قلع کر کے بنیتا اور اپنے سامنے درزی سے سلوایا تھا۔ انگر کھاتیار کر دیا اور جامہ دار کا چغہ بھی بنوایا تھا غرض اس ٹھاٹھ سے ہم حیدر آباد سے اورنگ آباد روانہ ہوئے وہ جلسہ کیا تھا، صلائے عام تھی یار ان نکتہ داں کیلئے حیدر آباد سے نواب مسعود جنگ، حیدر نواز جنگ، شاد یار جنگ، امین جنگ، فخر یار جنگ، معشوق یار جنگ سب مدعو تھے غرض کہ حیدر آباد کے جنگوں سے اسٹیشن ایسا پٹ گی تھا کہ گویا غور کسی محاذ پر جارہا ہے۔ اسٹیشن پر ایک چہل پہل تھی۔ بھالہ فرحت پارے کی طرح بے چین اور بے قرار تھے کہ کب ریل چلے اور کب ہم اورنگ آباد میں جا دھکیں پان پر پان کھا رہے تھے اور سگریٹ پر سگریٹ پلا رہے تھے، کبھی درجے میں گھستے تھے اور کبھی پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگتے تھے۔

اس موقع پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا، بھالہ فرحت کہ اُس وقت تک وحید الدین سلیم سے یاد اللہ نہیں تھی، دونوں ایک دوسرے کے نام سے تو واقف تھے مگر صورت سے نا آشنا تھے وحید الدین سلیم کو بتا چلا کہ میاں فرحت بھی اورنگ آباد جا رہے ہیں اور غلاں ڈبے میں بیٹھے ہوئے ہیں، بس بے قرار ہو کر لپکے اور ڈھونڈتے ڈھنڈاتے، پتا لگاتے، پانتے، لاپتے اُن کے درجے تک جا پہنچے۔ بھالہ فرحت ادھر اپنے ڈبے سے نیچے اترے اور ادھر مولانا سلیم نے ایک کپڑا نہ دو بس لیٹ ہی تو گئے اور ایسے لیٹے کہ اب چھوڑتے رہا نہ جا، بھالہ فرحت نے بہت، کوشش کی کہ اُس بوڑھے کے شکنجے سے نکلیں، مگر وہ کہاں چھوڑنے والا ہے یہ قہقارہ کرتے آنا ہی اُن کا شکنجہ مضبوط ہوتا چلا جاتا تھا۔ آخر بے اختیار بے اختیار چھوڑ بولے، کہ خدا کے واسطے یہ تو تباہ کن میں نے الیا کون سا تصور

کیا ہے جس کی یہ سزا دی جا رہی ہے۔ کہنے لگے سب سے بڑا قصور تو یہ ہے کہ تمہ نے
نذیر احمد کی کہانی لکھ دی ہے خدا جاننا ہے فرحت! جب سے میں نے تمہارا وہ مضمون
پڑھا تب سے طے کو دل تڑپ رہا تھا۔ بارے آج وہ مراد پوری ہوئی ہے تو یہ ہے
کہ مضمون کیا لکھا گویا مرنے کے بعد تم نے نذیر احمد کو ہمیشہ کیلئے زندہ کر دیا۔

افسوس! ہمارا کوئی ایسا شاگرد نہیں جو ہمارے مرنے کے بعد ہمیں بھی اسی طرح زندہ
کر دے بھائی فرحت نے کہا آپ فکر نہ کیجئے، اگر آپ کے کسی شاگرد نے یہ سعادت
حاصل نہیں کی تو پھر میں اس کی تکمیل کر دوں گا۔ فرمایا سچ کہتے ہونا؟ کہنے لگے اگر یقین
نہ آئے تو بسم اللہ ابھی سر کر دیکھ لیجئے، اگر مضمون نہ لکھ دوں تو میرا نام فرحت نہیں
سیم تو بلا کے زندہ دل آدمی تھے، ان باتوں سے اُن کے جسم میں زندگی کی ایک ہر دوڑ
گئی۔ وہ کھل کھلا کر ہنسنے کہ فغا و گونج گئی۔ اس کے بعد ریل چلی، یہ دونوں ایک
ہی ڈبے میں لگے اور رات بھر گئیں اڑاتے رہے۔

مختصر یہ کہ ہنسنے ہنسنے دوسرے روز اورنگ آباد پہنچے۔ شاید
دوسرے روز رات کے وقت دہلی کا شاعرہ ایلیج ہوا۔ اس کے کیا کہنے کہ نقلی
کو اصل کر دکھایا تھا۔ اور سچ تو اُس پر اتنا خرچ بیٹھا تھا اور قسمت سے ایسے
ایسے موزوں لوگ گٹھ گٹھ تھے کہ پھر کسی کو دوبارہ ایلیج کرنے کی ہمت نہیں ہوئی
ہر شاہزکی وضع قطع، رنگ روپ، صورت شکل نشت بر خاست کا طریقہ، لباس
اور طرز گفتگو کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا اور ہر ایک نے ایسا سوانگ بھرا تھا
کہ اصل اور نقل میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ ایلیج پر قدم دھرتے ہی یار لوگ
شور مچا دیتے تھے کہ وہ مومن خاں آئے، وہ غالب آ رہے اور وہ استاد ذوق تشریف
لا رہے ہیں۔

اُس شاعرے کی ایک تصویر میرے پاس پڑی رہ گئی ہے، اُسے آپ
بھی دیکھئے اور شاعروں کو پہچانیئے۔ اگر کوئی دقت ہو تو بھائی فرحت کا شاعرہ،

کہ شعر مراد ہے کہ بُرو، چنانچہ لڑکے نے یہ شعر بڑھا کہ ”سانڈ سے تھے بلوں
 میں غنہ چھلنے“ پوچھا مولوی صاحب! یہ سانڈ سے کی معنی ہیں۔؟ ملا صاحب نے
 سانڈ سے کی طرح سمجھا کر فرمایا کہ سانڈ سے سانڈ کا جمع ہے جیسے بھینس سے بھینس، مرغ
 سے مرغ اور سانڈ سے سانڈ ہے۔ پھر کہنے لگے کہ یہ شعر اس طرح بھی لکھ سکتے تھے
 کہ ”تھے سانڈ بلوں میں منہ چھپائے“ مگر مولانا حالی پر انے زمانے کے شاعر ہیں اس لیے
 انھوں نے یہاں بھی پرانی جمع کو برقرار رکھا ہے۔

بالکل اسی طرح کا واقعہ میرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون کے ساتھ پیش آیا
 ان کا تذکرہ میراج کی کہانی والا مضمون ہے اسے کے کورس میں داخل تھا۔ اس مضمون میں مولوی
 غلام یزدانی صاحب (سابق ناظم آثار قدیمہ حیدرآباد دکن) کا پورا نام لینے کی بجائے
 جگہ جگہ اسی طرح لکھ دیا ہے کہ ”دانی نے کہا“ اور دانی میرے ساتھ تھے، دانی نے آواز
 وغیرہ، پروفیسر صاحب پڑھا ہے تھے، ایک طالب علم نے پوچھا کہ جناب! یہ
 دانی کون صاحب ہیں؟ پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ دانی کسی شخص کا نام نہیں ہے یہ لفظ
 دانتوں سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں آگچھا۔ پُرانے شعراء اور علما متقدمین اپنے
 شعروں میں لفظ ہاتف لیتے تھے، میرزا فرحت اللہ دور جدید کے شاعر ہیں اور علما
 متاخرین سے ہیں، اس لیے آپ نے بجائے ہاتف کے دانی کو اپنا دوست لکھا ہے جس کے
 معنی ہیں آگچی (یا باتل ہے تو) چنانچہ میرزا فرحت اللہ کہتا ہے کہ ”دانی ہاتف گفت“ مگر یہ
 دور جدید کا ادب کہتا ہے کہ دانتے کہا۔ بس صاحب موصوف نے بجائے لفظ ہاتف
 کے دانی استعمال فرمایا ہے یعنی ”آگچی یعنی عقل“ اسے نوٹ کر لو۔

لوگوں کا تاثر توڑ فرمائشوں سے مرحوم نے اپنے مضمونوں کی پہلی جلد میں

فرحت کے نام سے چھاپا۔ مجھ سے کہنے لگے میلا! ایک صفحہ خالی ہے میں نے کہا اب
 کیا ہو گا! لکھنے لگے تاریخ کہنا چاہیے؟ میں نے کہا تاریخ ”پیدائش“ سے آج تک
 تو تاریخ تو کچھ نہیں، مگر دیکھئے کوشش کرتا ہوں۔ گھر آیا، ادھر ادھر راست

مہر جال و التاریخ اور صبح ہوتے ہوتے ایک مادہ تاریخ دِام نگر میں چھانی لایا۔ دوسرے روز علی الصبح اُن کے پاس پہونچا اور قطعہ تاریخ کہہ سنایا، وہ آپ بھی سن لیجئے۔

مضامینِ فرحت کی شیرینیاں برہمائی میں پڑھنے کی دلیاں ہوس
روانی بلا کی عبارت میں ہے ظرافتِ عبرے میں وہ مغفوں کو بس
پڑھو ایک جملہ تو گھنٹوں ہنسو ظرافت بھی سنائی کے کہتی ہے بس
کہی ہم نے بھی اس کی تاریخ طبع نہیں مگر چہ عظمت کو اس فورے سن

ہے تاریخ کیا ہے یہاں جواب

کہ اک ہار پڑھ اور دس بار سن

انھوں نے فوراً مادہ تاریخ کا پوسٹ مارٹم کیا تو دیکھا کہ ۱۳۳۴ء کا برابر

آ رہا ہے۔ بہت خوش ہوئے پھر کہنے لگے کہ میاں! تاریخ تو خوب کہی ہے مگر عیب یہ

ہے کہ تم نے اوپر کہیں اشارہ بھی نہیں دیکھا اس سے سنہ فصلی نکلتا ہے دوسرے

ہندوستان کے لوگ فصلی کیا سمجھیں گے، اُن کیلئے تو ہجری سنہ ہونا ضروری ہے۔ میں

تو اس شش و پنج میں رہا کہ نو عدد کس طرح بڑھاؤں اور فصلی کو ہجری کیسے بناؤں۔

مگر انھوں نے ایک کہی نہ دو، فوراً چلتے شکر کا پہلا سفر دیکھی ہم نے بھی اُس کی تاریخ

طبع کو کانٹ چھانٹ کر اس طرح کیا یہ کہی سالِ فصلی میں تاریخ طبع اور آخر میں یہ

شعر اضافہ کر دیا۔

جو درکار ہو سنہ ہجری تمہیں

اسی پر اضافہ کرو نو و دس

مضامینِ فرحت کی پہنی جلد چھپی اور ہاتھوں ہاتھ ختم ہو گئی۔ پھر مضامین

فرحت کا دوسرا حصہ چھپا، تیسرا چھپا، چوتھا چھپا، یہاں تک کہ یہ عدد سات حصوں

تک پہونچا، اور اب بھی خدا کے فضل سے اتنا سال مسالا موجود ہے کہ دو تین جلدیں

اور طبع ہو سکتی ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ بہترین مزاح نگار تھے۔ اس قسم کے مضمون لکھنے والوں میں پطرس، رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی، ایم اسلم، سندباد چسپازی، شوکت تھانوی اور ملٹار موزی بہت مشہور ہیں۔ اگر آپ سلامت زبان اور حسن بیان کے چمنار سے لینا چاہیں اور موقع نگاری کے دلچسپ نمونے یا ہماری قدیم ہندو یب و تمدن اور پڑانے لوگوں کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھنی چاہیں تو مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون پڑھیے ان میں ظرافت کے ساتھ کیا ست اور ذہانت بھی ہے اور مضمون نگاری کے بہترین نمونے بھی ہیں۔ جس مضمون کو اٹھا کر دیکھیے کس کس حوالہ سے ان کے ضمیمہ خالی نمایاں کیے ہیں اور کس کس نزاکت سے مختلف مناظر پیش کیے ہیں کہ ایک بار مرصود بھی دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے اور کارٹونٹ بھی دیکھ کر رہ جاتا ہے اور کارٹونٹ بھی دیکھ کر رہ جاتا ہے۔

ظرافت اور خوش مذاقی تو مرحوم میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ہر چیز کے ظریفانہ رنگ میں دیکھتے تھے اور اسے دلچسپ اور لطیف انداز میں بیاں کر جاتے تھے جسے سن کر خوشی اور مسرت کی ہر دوڑ جاتی تھی۔

مرحوم تاثر توڑ مضمونوں پر مضمون لکھنے لگے اور دھڑا دھڑا مضمون کے حصوں پر حصے چھپنے لگے تو بعض اہل قلم جل اٹھے اور ان کے خلاف محاذ تیار کر نے لگے۔ مرحوم کو سب خبر تھی۔ مگر ان کے خلاف میں زبان نکال نہیں پلاتے تھے اور ان کی شان کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک صاحب تشریف لاٹے اور کہنے لگے کہ مرزا صاحب! آپ نے اپنے تعلق کچے اور بھی سنا۔ کہنے لگے سنا تو بہت کچھ ہے، مگر اب تم آنکا دود سے آٹے ہو تو خالی ہاتھ کیوں جاؤ، تم بھی کچھ سنا جاؤ۔ کہنے لگے ظالم صاحب نے آپ کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ فرحت کو تو پیضہ ہو گیا ہے۔ پس کر کہنے لگے کہ اگر یہ بات ہے تو بلایا! پھر نیامے لوب سے جاتے ہیں، خدا کے واسطے تم ہکا بوندہ رہو اور ہمیشہ کمریر

جب مرحوم نظامت سوم عدالت پر ناظم ہو کر گئے تو ایک صاحب مبارکباد دینے آئے اور پوچھا کہ آپ کہاں کی نظامت پر گئے ہیں؟ کہنے لگے، اب میں تھرڈ کلاس کی نظامت پر مقرر ہو گیا ہوں اور آج سے تھرڈ کلاس بمبٹریٹ بن گیا ہوں۔

ایک صاحب تشریف لائے اور انھوں نے اپنی کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔

اس کے دو چار مضمون دیکھے، پچیس پچیس سے تھے، کہنے لگے یہاں! مقدمہ تم خود کچھ ڈالو اور میرے نام سے چھپو اور، کہا، مگر آپ کا رنگ کیسے آئے گا؟ کہنے لگے میرے رنگ کی فکر مت کرو، تم ایسا رنگ اختیار کرو جس میں تمہارا رنگ جم جائے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب سر ہو گئے کہ نللا عنڈاں پر ایک مزاجیہ مضمون لکھ دیجئے کہنے لگے کہ میں تم خود لکھو۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے یہی سوچتے ہو اسی طرح شروع کرو، یہ لکھو، یوں ختم کر دو، اللہ اللہ خیر سلا۔ کہا کہ یہ آپ ہی لکھ دیجئے۔ کہنے لگے کہ میں تو اب خوش مذاقی کی فوج کا بوڑھا کیڑا رہا ہوں، انجینئر ہوں، لڑتا نہیں لڑاتا ہوں، تم جوان ہو، دماغ لڑاؤ، مجھ سے اچھا لکھ سکو گے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ نصیحت جنگ اسناد جلیلی سے ملنے جا رہے تھے، میں

جھانک کے ساتھ چھو لیا۔ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ان کے پاس اختر بار جنگ مرحوم، بیٹھے ہیں اور دو چار شاہزادے اور بھی تھے۔ اختر بار جنگ نے ایک شعر پڑھا۔ جس میں نکر کو مونٹ ہانڈھتا تھا۔ اسناد جلیلی نے مسکرا کر بھائی فرحت سے پوچھا کہ نکر کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے۔ کہنے لگے جناب! میں تو دونوں طرح ہانڈھتا ہوں، فرمایا وہ کیسے تو کہنے لگے کہ جب دیکھتا ہوں کہ والہی کوئی زبردست نکر پڑا ہے تو اُسے مذکر، ہانڈھتا ہوں اور اگر کوئی بھولی موٹی معمولی نکر ہے تو پھر اسے مونٹ ہانڈھتا ہوں۔

نشا عسکری تو بھائی فرحت کے ریس وریشے میں تھے اور وریشے میں آئی تھی

خائب، موسیٰ خان، حکیم آغا جان عیش، خواجہ میر درد، اور سعادت یار غلام رحیم۔
 یہ نزدیک کا رشتہ تھا، پھر پورے کا پورا خاندان شاعر تھا۔ چچا عنایت اللہ بیگ
 شاکر، چچا عبد العزیز بیگ، ڈاکٹر، خواجہ قمر الدین راقم (خلف خواجہ بدر الدین خان مترجم
 بوستان خیال) چچا رفیع الدین وحشی، مرزا ساجد بیگ سب کے سب شاعر اور صاحب
 دیوان ہیں۔ اس حساب سے اگر دیکھا جائے تو بہ قول شیخے بھائی فرحت نے شاعری کا،
 گود ہمیں پرورش نہیں پائی تھی، بلکہ اس کے کاندھوں پر بھی کودے ہیں۔ تو نہ پر
 بھی اچکے ہیں اور دو لیتیاں بھی جھاڑی ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کرنل کے دربار کے موقع پر دہلی، شاعروں کا
 اکھاڑا ہوا تھا۔ ہمارے گھر میں (جو دہلی ڈپٹی سلطان خان) ہر چیلنے مشاعرہ،
 ہوتا تھا اور اس مشاعرے میں بھائی فرحت بھی اپنی غزل پڑھا کرتے تھے اور وہ،
 زوروں پر پڑھتے تھے کہ محفل پر چھا جاتے تھے اگر دیتے تھے تو صرف آغا شاعر دہلوی
 سے، اس کی آواز اس بلا کی تھی اور پڑھنے کا انداز اس غضب کا تھا کہ بے اختیار،
 سامعین کے منہ سے واہ واہ نکلا جاتی تھی۔

بھائی فرحت کہتے تھے کہ یہاں اس جم غفیر میں غزل و زل کون پرکھتا ہے
 اصل چیز تو غزل پڑھنا ہے جو پڑھنے میں دنگ ہو گا وہی سب کو دبا لے گا۔ کہتے تھے
 کہ اگر غزل کمزور ہے تو گا کر پڑھو اور کہیں سکتے ہو تو کسی لفظ کو کہیں جان کر
 پڑھ جاؤ، کسی کو غلطی کا پتا بھی نہیں چلے گا وہ کہ یہ بھی خوب پڑھتے تھے آواز
 رسیلی اور پاٹ دار تھی، خود ایک مقلع میں کہتے ہیں۔

بزمِ غنا میں فرحت اردو کے سب شاعر سے

وہی غزل پڑھا کرے تھوڑا بہت جو گائے

تحت اللفظ آغا شاعر کے ڈھنگ پر پڑھتے تھے اور اس بجا ہی راز،

تبتے تھے۔ ایک مرتبہ آغا شاعر نے غزل پڑھی، لوگوں نے وہ گائے بھاڑ پھڑا کر

تو نہیں کہیں کہ آوازیں سنہ گئیں اور خاص کر اس شعر کو تو کئی بار پڑھوایا ہے

ہر بن مو پر رکھے میں اس نے تلواروں کے منہ

کر رکھا ہے اس نے دامن پکبہ چک میرے لیے

مشاعرہ ختم ہوا تو مرحوم آغا شاعر سے کہنے لگے کہ ارے میاں! تمہارا یہ شعر

بائیں پلٹا سا ہے اس کا تو کوئی مطلب نہیں؟ آپ استاد مانے جاتے ہیں، ایسے شعروں سے

آپ کے نام پر بتائے گا۔ آغا صاحب نے ہنس کر جواب دیا کہ لوگوں کو آہمانے کے

لیے غزل میں ایک دو شعر ناسخ کے رنگ کے بھی ہونے چاہئیں تاکہ اپنی مشاعرہ کی سخی

نہی کا اندازہ ہو سکے۔

شاید دہلی دربار کے کچھ عرصے کے بعد ہی مولانا حسرت موہانی نے علیگڑھ

میں ایک زبردست مشاعرہ کیا تھا، یہ کل ہند مشاعرہ تھا۔ اس وقت بھالائے فرحت کی عمر

کوٹا اٹھارہ، انیس سالہ کی ہوگی۔ یہ بھی اپنی غزل دہائے ہوئے پہنچے اور وہاں،

پہنچ کر ایک ایسے بلکہ دو غزلیں سسل پڑھیں اور اس ٹھاٹھ سے پڑھیں کہ مشاعرہ

واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اس غزل کے دو تین شعر اب تک

مجھے یاد ہیں وہ آپ بھی سن لیجیے۔

موت تو آہی چکی تھی وقت پر یار آگیا

ڈوبتے کو ایک تنکے کا سہارا ہو گیا

مجھ مریضِ عشق کا کرنے کو آئے ہیں علاج

لوجیسٹوں کی خبر ان کو بھی سودا ہو گیا

نیم جاں پہلے تھا فرقت اور ہنوا فرقت نے عیب

اونگھتے کو ٹھیلے کا اک پہنا ہو گیا

یہ تھی ان کی دہلی میں شاعری، اب چاہے اسے تلبیس شغنی کہیے یا ہاتھی کے

دانت سمجھئے مگر یہ ضرور ہے کہ اصلی شاعری حیدر آباد آسنے کے بعد

شروع ہوا۔ یہاں معشوق علی خاں جوہر تھے، خود شہید حسین خاں نے اور کئی
اچھے اچھے شاعر تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ بعض ایسی غزلوں کا ذکر چھڑ گیا جو سنت
اور سنگا خان زمینوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک صاحب نے شاہ نصیر کا وہ غزل سنا
جس کا مصرع ہے۔ ع

”یہاں ہے کہ با چشم ہر بشر سے فلک پر بجلی زمین پر باراں“
اسی غزل کے نظم ہونے کے بعد ایک صاحب نے ایک مصرع موزوں کر کے پڑھا۔ ع
”نظام شمسی ہوا ہے اتر فلک پر پتھر“ زمین پر سے۔
اور زمین آسمان کے قلابے طارنے لگا۔ بھائی فرحت اُنہ کر پھٹنے لگے، پھر گھر میں
لگے اور خدا جھوٹ نہ بلائے کوئی دس بارہ شعر لکھ کر لے گئے مجھے اس کے دو شعر
یاد رہ گئے یہاں وہ آپ بھی سن لیجئے۔

جواہر نکلے چارے دل سے تو دونوں عالم کا ہویم عالم
فلک زمین پر، زمین فلک پر، فلک پر پتھر زمین پر تارے
پہاڑ سوز دروں سے اڑ کر ہوئے زمین کی کشش سے باہر
نظام شمسی ہوا ہے اتر، فلک پر پتھر زمین پر تارے
خدا معلوم یہ شعر انھیں بچے سے یاد تھے یا فی البدیہہ کہہ ڈالے تھے۔ پھر حال اس غزل
کی بڑی تعریفیں ہوئیں، مگر ہمارے حکیم جی کو جوش آگیا، میری طرف اشارہ کرتے کہنے لگے
کہ آپ شکل سے شکل طرح عصمت کو دیں اگر وہ غزل نہ لکھے تو آپ اس کی ناک کاٹ
لیں۔ مرموم نے کہا کہ قبلہ! اگر اسی قسم کے دو چار شرطیں آپ بدلیں گے تو چند روز میں،
خدا نے چاہا تو اس کی ناک جڑ سے غائب ہو جائے گی۔

حکیم جی کسی سے نہیں دیے اور اگر دیے تو بھائی فرحت سے وجہ یہ تھی کہ
پہلے تو مرموم کو متعدد شعراؤں کے سینکڑوں شعر یاد تھے، دوسرے قدیم استادوں کے
دیوان ان کی نظر سے گزر چکے تھے اور تیسری بات یہ کہ مرموم دلفیہ ادبیات و مہمانی

انہوں نے خود بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اور اُستادوں سے بھی پڑھا تھا۔ انھیں زبان پر عہد تھا
 بہرہ ور رہیں پر پوری طرح حاوی تھے۔ مولوی غلام یزدانی صاحب جب ان کے پاس
 یا معنوں میں کوئی کثور لفظ دیکھتے تو فوراً ٹوکی دیتے تھے۔ کبھی جی میں آیا تو اُس
 لفظ کی جگہ کوئی دوسرا لفظ بٹھا دیتے تھے اور کبھی اڑ جاتے تو ادھر کا دنیا ادھر
 ہو جاتے وہ اپنی بات کا پتہ نہ چھوڑتے رہتے۔ سند میں دو پار شعر بھی پڑھ دیتے
 اور کہتے تھے کہ دہلی میں برابر ہی بولتے ہیں اور یہ بالکل فصیح ہے وہ کہتے تھے کہ
 بولتے تو ضرور ہیں مگر اسی لفظ کو موقع اور محل سے استعمال کیا جائے تو فصیح ہے
 مگر یہاں تو یہ لفظ معنوی سا معلوم ہوتا ہے بہر حال نہ تو کسی دوسرے میں اتنی
 ہمت تھی جو انھیں ٹو کے اور نہ وہ کسی کا مانتے تھے۔ اگر کوئی دوسرا شخص اُن
 کے خلاف کسی کا سند پیش کرتا تو کہتے تھے کہ میں! تم دوسروں کا سند کیا دیتے
 ہو! یہ بھی جانتے ہو کہ ہم کس خاندان سے ہیں! ہماری بات خود سند ہے۔ غرض یہ کہ
 مولوی غلام یزدانی صاحب سے انھیں بڑی محبت اور بڑی عقیدت تھی اُن کے
 متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں کہ

میرے اندازِ روش پر بہرہ صلاح خیالی
 محتسب سے کم نہیں فرحتِ برادرانی مجھے

سرزا فرحت اللہ بیگ نہایت پُر گو اور فی البدیہہ کہتے دوائے شاعروں میں
 سے تھے ان کا شال ایک ایسے درخت کا سی ہے جسے ذرا ہلاد اور بیسیوں کے
 پھل چن لو، اکثر شعراء طرح کے خُلاف ہیں اور ایسے شعروں میں کاشتق کا پہلا زینہ
 سمجھتے ہیں۔ جس طرح ابتدا میں بچوں کو کٹکھینے ڈال کر اُف! بے مکھن! کہلاتے
 ہیں پانے رنگ روٹ کو رائٹ لیفٹ کا آواز پر قدم ڈالنے کا شق کراتے ہیں اُس
 ہی طرح نوں کے یا بھٹی شاعر کو طرح دے کر طبع آزمائی کراتے ہیں اور یہاں
 سخن میں کالم دیتے رہتے ہیں، بھال! فرحت بھی طرح کے بالکل خُلاف تھے بلکہ

میرا تو دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے شاعر فرحت اللہ بیگ ہیں جنہوں نے پہلے کاغذ پر
 لکھ کر تصدیق طرہی شاعر کے طریقے کو نوڈا اور پھر طرح شاعر کے ڈولی ڈولی
 ان تمام باتوں کے باوجود وہ ریڈیو کا آواز، گریو فون کے ریکارڈ، نغموں کی صداؤں
 اور سوسائلف نیچے والے لہڈوں اور راہ گیروں کو آوازوں پر کان لگائے
 رہتے تھے جہاں کوئی اچھی یا شگفتہ زمین کا لہڑی پڑی اور فون غزل یا نظم
 لکھنے بیٹھ جاتے تھے۔

ایک مرتبہ بچے گریو فون بجا رہے تھے کسی نے علی حسین نابینا کا گایا
 ہوا ریکارڈ وہ اشربو، اشربو، اشربو، اشربو لگا دیا۔ بس مرزا صاحب کو جوش
 آگیا۔ قلم دوات لے کر بیٹھے اور اُسی وقت دس بارہ بند کہہ ڈالے۔ دو ایک
 بند آپ بھی سن لیجئے

میرے دل میں بس اک یہی آرزو

سب بھرے میکے کے ہوں جاؤ جو

اور کچھ مجھے وہ ساقی شعلہ زد

”میں بھی دیکھوں بھلا کتنی پیتا ہے تو“

”اشربو، اشربو، اشربو، اشربو“

ایسا دیکھا نہ ہو گا تم ساشہ کوئی

ہے قیامت جو رہ جائے تشنہ کوئی

ختم ساقی نے کر دی ہے دریادلی

دوش پر خم ہے اور یہ صمد اکو بکھ

وہ اشربو، اشربو، اشربو، اشربو

ایک مرتبہ سجاد مرزا صاحب نے نظامِ انتظام کا آزاد ترجمہ کرنے کا اعلان کیا

اور شاید اس کیلئے دو یا تین سو روپیہ انعام بھی مقرر کیا تھا۔ اسی زمانے میں،

سجاد احمد صاحب عثمانیہ ٹریننگ کالج کے پرنسپل تھے اور اس سال کئی ایسے
مدرسین ٹریننگ حاصل کرنے کیلئے اضلاع سے آگئے تھے، جنہیں شہو شاعری
دلچسپی تھی، ان کا خیال تھا کہ ٹریننگ کالج کے طلباء ویا مقامی شعراء و ماغ لڑائیوں کے
اس طرح نئی نئی نظمیں بھی دیکھنے میں آئیں گے۔ طلباء کو اعداد بھی ہو جائے گی اور ایک
اچھا تلمیذ تیار ہو جائے گا۔ بس اس اعلان کے دوسرے روز ہماری اپنا ترجمہ لے کر
ٹریننگ کالج پہنچے، بڑے بڑے ریکارڈ تیار کر لیا اور جو کچھ انہیں انعام ملنا چاہیے
تھا وہ دوسروں کو دلوادیا، وہ ترانا بھی سن لیجئے۔

اس پر ہے حق ہریاں حق کا ہے وہ پاساں عقل کا ہے رہبری ساتھ میں امن امان
شاہِ دکن زندہ باد۔

دل سے ہے اس پر خدا ملک کا چھوٹا بڑا سب کا محافظ ہے وہ اس کا محافظ خدا

شاہِ دکن زندہ باد

سب کا وہ سردار ہے یونس و یحیٰ وار ہے رحمت ہے ورثہ گار اس کا مددگار ہے
شاہِ دکن زندہ باد زندہ و پابند باد

یہ شاعری انہیں کیسے آئی! بس خود بہ خود آگئی، نہ تو وہ کسی کے شاگرد
تھے اور نہ وہ شاعری کے معاملے میں استاد اور شاگردی کے تابع تھے۔ کہتے تھے
میاں! یہ بھی کوئی گانے بجانے کا فہم ہے کہ کہیں استاد نے گلکاری بتا دی اور کہیں
سال سُر درست کر دیا۔ شاعری تو ایک کیفیت ہے جو دل پر طاری ہوتی ہے اور شاعر
اپنی زبان میں ادا کر جاتا ہے اب یہی زبان اور محاورے تو اس حد تک خیر استاد
اپنے استاد کا ہاتھ تباہ کر سکتا ہے، ورنہ شاعر کیلئے تو اس کی بھی ضرورت نہیں ہے،
شاید یہی سبب تھا کہ وہ کسی ایک رنگ پر نہ ٹک سکے اور بہ قول شخص نے یہ کلام ہو کر
پیدہ اپنی شاعری میں سر پٹ دوڑنے لگے۔ ان کا دلوان دیکھو تو ایک جگہ سب سے جس میں
رنگ رنگ کے پھول نظر آتے ہیں۔

ہمارا جہ کشن بہ شلہ آنجہانی مرحوم کو بہت چاہتے تھے اور طرح طرح سے ان کا ہول
بڑھاتے تھے۔ ہمارا جہ بہادر کے محل میں ماہانہ ایک شاعرہ خاص ہوتا تھا جس میں
منتخب اور خاص خاص چوٹی کے شعرا شریک ہوتے تھے۔ وہ طرحی شعرے دیتے جلتے
تھے، ایک فارسی کا اور دوسرا اردو کا۔ پھر عابد حسین بیگم ریختی خوب کہتے تھے اور کہتے
نہ کہتے، تمام عمر یہی پا پڑ بیٹے تھے، لکھنؤ میں پرورش پائی تھی اور ریختی گولڈورسٹ
میں آئی تھی۔ شاید ایک صاحب مزاجیم رنگد میں بھی خوب کہتے تھے۔

اب اس شاعرے کا حال بیٹھے۔ دوسرے شاعر تو ایک یا دو غزلیں پڑھ کر
بیٹھ جاتے مگر مرحوم تین تین اور چار چار غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ فارسی میں
الگ، سینے میں الگ، ریختی میں الگ اور مزاجیم رنگ میں الگ۔

ریختہ ملاحظہ ہو۔

ہوں مشت خاک لیکن ہستی کی داستاں ہوں
دیکھو تو کچھ نہیں ہوں سمجھو تو اک جہاں ہوں

کس طرح قافلے کے ہمراہ چل سکوں میں
جو اٹھ کے بیٹھ جاٹے وہ گرد کار وہاں ہوں

آزادی حقیقی مٹی ہے کس کو بلبلس

تو ہے قفس میں اور میں پابند آشتیاں ہوں

خیر، ریختے کے تو یہی کہنے میں اب ذرا الٹا ریختی لحد مزاجیم رنگ ملاحظہ
فرمائیے کہ کتنا بختہ ہے۔ بیگم سہا کر اجمل پڑے، خواجہ حسن نظامی لوٹ ہو گئے
اور ہمارا جہ بہادر تو کہنے لگے کہ آج واقعی معلوم ہوا کہ ریختی کسے کہتے ہیں۔

ذرا ملاحظہ ہو کہیں ایک بھی رکیک یا سو قیانا نہ لفظ ہے۔

کیا ہی غضب دیکھ بوا ہو گیا
سنا آج آج کا سزا ہو گیا
چھوڑ دی میں اور جلا ان کا ماتھ
تھا ہی قسمت میں بد ہو گیا

ہو کہ سی کیوں اٹھتی ہو دل میں تر
کیا دہر کہیں تجھے خفا ہو گیا
خیر سے اللہ انھیں لکے ہاں
ہو لوں سے یہ حال برا ہو گیا
تجھ کو تو خام ہے بس ایک ہی
دورنگوڑی تجھے کیا ہو گیا

کیا ہی پچھائی ہوا فرحت نے دھوم

نون جو سالن میں ذرا ہو گیا

اس طرح تابڑ توڑ غزلوں پر غزلیں نکھنے لور شاہری کی ہر صنف اور ہر
رنگ میں طبع آزمائی کرنے سے نظمیں اور غزلوں کا دہنار مل گیا اور وہ زبردستی
کے شاعر بن گئے۔

مرحوم مرتے دم تک برابر اردو کی خدمت کرتے رہے۔ مرنے سے
دو دن پہلے اردو مجلس کا جلسہ انھوں نے خود اپنے گھر پر ہی کیا تھا۔ نواب
مقصود جنگ بہادر نے آغا حشر کاشمیری پر مقالہ پڑھا تھا اور مرحوم نے بہت
ہلک ہلک کر اپنی ایک غزل سنائی تھی جو غالب کے رنگ میں تھی۔ یہ قول سجاد مرزا تھا
یہ اُن کا سوال سا نک تھا۔ اس کے دو تین شعر آپ بھی سن لیجئے۔

دل برا روز ازل سے بے قرارِ نغمہ ہے

ہر نفس میں کیلئے آوازِ تارِ نغمہ ہے

یہ نہیں آوازِ مطرب ہے رواں اک جوشید

تار جو اس میں ہے گویا آتشِ نغمہ ہے

میں کہاں فرحت کہاں اس طرزِ غالب میں غزل

ہے مگر روزِ ازل کا ہی خسارِ نغمہ ہے

یہ عجیب بات ہے کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد پکا آئندہ کے جلسے کے پورے

انتظامات سجاد مرزا صاحب کے سپرد کیے اور کہا دیکھو بھلا آئندہ جلسے کا
جلسہ نہ کرنا، گویا اُن کا آخری وصیت تھی اس کے بعد کولہ تیس گئے اور دیئے

اور دوسرے روز آثار کے دن ۱۲۶ اور ۱۲۷ اپریل کھنڈ میلانی شب میں وہ سہ
جہاں نکلے رخصت ہو گئے۔ مولوی مسعود علی صاحب محوی نے تاریخ پکھی ۵

تھے فرحت بڑے پسواں سنیں

زبان معانی تھے جملہ سنیں

خود اٹھ گئے اٹھ گئے اٹھ گئے اٹھ گئے

پہاں زبان، عرو شاہ سنیں

عادل خزاں آگئی باغ میں

گی بیسیل گشت سنیں

۱۳۶۲ھ

سجاد مرزا

سجاد مرزا صاحب، مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم سابق پوز سیکریٹری حکومت حیدرآباد کے منجیلے صاحبزادے ۱۲ مارچ ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ یہیں ابتدائی تعلیم پائی۔ پھر علیگڑھ میں پڑھا۔ اسکے بعد وہ تعلیم کے لیے آئے۔ پھر وہاں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے کیمبرج چلے گئے۔ علمی اور لادھی ذوق اور تعریف و تالیف کا شوق انہیں اپنے والد سے ورثہ میں ملا ہے۔ نکتہ سخن ادیبانہ عقائد ہیں۔ تعلیمی دنیا میں تجربہ کا وسیع میدان ملے کر کے اعلیٰ معلومات اور چہارت حاصل کا اپنا ذاتی قابلیت، دیانت داری، محنت، جفاکشی، رواداری اور ہمہ تن کامیابی دولت خاص و عام میں اپنا اثر پیدا کیا اور علمی خدمات پر فائز رہے۔ مدرسوں کے صدر سے لے کر انسپکٹر آن اسکولس یہ رہے کالج کے پرنسپل یہ رہے۔ نائب ناظم تعلیمات یہ ہوئے۔ ایکو کیشنل سیکریٹری کی خدمت پر فائز ہو کر اہم کام انھوں نے انجام دیئے اور ۱۹۵۱ء کو چینی خوشی قبل از وقت خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔

تعلیمی دنیا میں باہر کے لوگ انھیں ماہر تعلیم کی حیثیت سے جانتے اور حیدرآباد میں تو بچے بوڑھے سب کے سب انھیں اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ بچے ان کا دیدہ زیب قاعدہ آنکھوں سے لگاتے رہتے ہیں۔ لڑکے ان کا ”خوب جوڑ“ کے جوڑ توڑ میں مشغول رہے ہیں۔ زیر ٹریننگ مدد سبھی ان کا

ہدایات اور لکچر کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ ہزاروں ان کا مجوزہ پہلے شک
ہندوستانی کتابوں کی جستجو میں رہتے ہیں۔ عملت امد کثرت کے موقع پر اکثر
پر لیں کے لوگ ان کا ایجاد کیا ہوا ایک ٹائپ استعمال کرتے ہیں اور کھ
کمرشیل پرنٹر اور دور جدید کے خطاطوں کے نو ایجاد بنیادی خط سے ٹائپ
پیج سرخیاں اور بورڈ رنگے رہتے ہیں۔

سجاد مرزا صاحب (۱۹۲۱ء) میں جب انگلستان سے اعلیٰ تعلیم ختم کر کے
جسٹس ہو آئے تو محکمہ تعلیمات نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انھوں نے پہلے
بھنبی اور اس کے بعد اورنگ آباد پانہ اسکول کو اپنے نظریوں کی آزمائش گاہ بنا
۱۹۲۴ء میں انگریز آئی اسکولس ہو کر یہ گلبرگہ آئے تو مذہبی بھی اسی وقت
گلبرگہ میں تھا اور محکمہ تہذبات کی جریب ہاتھوں لے کر تھیں مکانات
اور مدرسہ ناپتا پھرتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اسی وقت گلبرگہ میں بڑے
بڑے منہلے سر پھرے اور مدینہ لوگ موجود تھے۔ انھوں نے آتے ہی
کچھ ایسا منتر پڑھا کہ وہ سب دھم ہو گئے اور ان کا کلمہ پڑھنے لگے۔ پھر توجہ
ہماد میں ان کی انتظامی قابلیت، مردم شناسی، رواداری اور طبیعت کا
شوخی کے رنگ لگائے جانے لگے۔ میں پہلے دن ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ
ان کا گھراؤ دقتا عموں اور خطاطی کے نمونوں کے نمائندگاہ بنا ہوا ہے پھر
دہان ہندوستان کے ہی قاعدے ہیں بلکہ چین، انگلستان، ترکی، روس اور
جاپان کے پر امیر بھی موجود ہے۔ یہی حال خطاطی کے نمونوں کا بھی تھا
ابن منقلہ سے لیکر میر علی کانتعلیق، مرزا شفیق کا کپٹ اور مرزا شاہ
کا شکستہ بھی شامل تھا یہ اس زمانہ میں بچوں کیلئے، قاعدہ تہذیب دے
رہے تھے ہر ٹائپ کے جوڑ توڑ میں بڑے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جیہ
کام کرتے ہیں تو پہلے اس کے لٹرچر گرا مطالعہ کرتے ہیں جب اس پر عمل

قابو پالیتے ہیں۔ تو پھر اس طریقہ سے ابتدا کرتے ہیں کہ بس انتہا کو اپنا دیتے ہیں۔ بڑے بحریوں کے بعد بچوں کا قاعدہ کا مسودہ تیار ہوا تجربہ کرنے کے معاملہ میں پہلے تو وہ خود اکپیرٹ میں دوسرے عبدالسلام صاحب نامی تعلیمات تھے اور تیسرے یہ بندہ اگرچہ گندہ عبدالسلام مرحوم کا قاعدہ اپنی پارٹی کے ساتھ قاعدہ ہاتھوں میں لیے تھا رستہ گھر سے دوہ پر نکلے اور شام تک برابر تجربہ کرتے رہتے تھے۔ رات کو رپورٹ پیش ہوتی اور صبح پھر کانٹ پھانٹ شروع ہو جاتی۔ غرضیکہ بڑی قلع دہر اور محنت و مشقت کے بعد قاعدہ مرتب ہوا۔ الفاظ کے چناؤ تصویروں کے انتخاب حرفوں کی جوڑ توڑ شوشوں اور دائروں کی تقسیم کرنے میں جو ڈھنگ اختیار کیا ہے اس سے ان کی ذکاوت اور حدت کا پتہ چلتا ہے۔ مختصر یہ کہ شروع سے آخر تک ان کا بچوں کا قاعدہ ذہنی کاوش تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے جس کی چند تصویریں نمائندہ اور حرفوں کے جوڑ توڑ میں حصہ لینے کا ندی کو بھی فخر حاصل ہے ہندوستان کے سب سے بہترین پریس ڈائمنز آف انڈیا میں اس کی رنگین تصویریں تیار ہوئیں وہاں ہلاک بنے اور وہیں طباعت کا کام انجام پایا۔

سجاد مرزا صاحب گلبرگہ میں کوٹا چار پانچ سال تک رہے مگر اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے وہاں ایک ذہنی انقلاب کی برقی ہر دوڑا دی یہ ہر کسی خاص زبان یا مذہب سے محض نہیں تھی ہر طبقہ ہر زبان اور ہر مذہب پر اپنا اثر ڈال رہی تھی۔ مدرسوں میں انھوں نے ایسے ایسے شاعری تفریح سامان اور دلچسپاں پیدا کیں کہ بچے مدرسوں میں شریک ہونے کیلئے دور دور سے کھینچ کر آنے لگے۔ شاعر۔ وہاں ہوتے تھے نقیلیں اور سوانگ وہاں بھرے جاتے تھے۔ اور جسمانی ورزش اور اسپورٹس وہاں ہوتے تھے جب سالانہ جلسے ہوتے تو اکثر لوگ حیدر آباد اور دور دراز مقامات

سے شریک ہونے لگے اور ان دونوں گھما گھمی اور چہل پہل رہتی تھی ان
 کی قابلیت اور فائدہ آلی تعلقات کی وجہ سے نواب سعادت جنگ بہادر سے
 ان کے گہرے تعلقات تھے۔ چہا راجہ بہادر آنکھالی بھی عزیزوں کی طرح
 ان سے ملتے تھے۔ اس طرح سالار جنگ مرحوم اور حیدر آباد کے دوسرے
 امرا سے بھی خاص رسم و راہ تھی اور گہری بے تکلفی تھی سجاد مرزا صاحب
 نہایت سلیجے ہوئے آزاد خیال بااُصول انسان پسند انسان ہیں اور کبھی وہ کسی
 کو رنج یا گزند پہنچانا نہیں چاہتے اور نہ کبھی وہ کسی سے لڑتے جھگڑتے مگر کون
 خدا کا بندہ مقابلہ پر اُتر آئے تو پھر جو کچھ ہی نہیں خم ٹھوک کر میدان میں
 اُتر آتے ہیں۔

بلگرہ ایک تاریخی مقام ہے اور آبادی کے لحاظ سے وہ ایک اچھا خاصا
 شہر ہے مگر آپ کو حیرت ہوگی کہ اس وقت تک وہاں ایک بھی مطالعہ یا کتاب خانہ
 نہیں تھا یہ ان کو کب گوارا تھا۔ دھرا دھرا چکر لگا کر ایک نہایت خوشگوار
 دل فریب اور دیدہ زیب مقام ڈھونڈ نکالا جو تالاب کے کنارے
 تعلقداری کے بالکل سامنے شہر کے وسط میں واقع تھا انھوں نے فوراً
 کتب خانہ کی کارروائی شروع کر دی اور اراغی تبصہ میں کر کے اس پر کتب خانہ
 عام کا پھیرا پرا دیا۔ یہ چیز بعض خود غرض لوگوں کو ناگوار ہوئی۔ بعض نے
 اختلاف کیا، بعض نے ناک بھنیوں چڑھائی چنانچہ ۱۲ جنوری ۱۹۲۸ء کو خود
 چہا راجہ بہادر شریف لائے اور اپنے دست مبارک سے اس کا سنگ بنیاد
 رکھ کر بڑی خوبی سے تبصہ کر دیا اس وقت اس کتب خانہ کا عمارت تالاب
 کے کنارے کھڑی ہوئی تشنگان علم کی پیاس بجھاتی رہتی ہے۔ اور سجاد مرزا
 صاحب کی ہمت اور کوششوں کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے۔

پس اس سنگ بنیاد کے بعد ہی ۱۹۲۹ء میں چہا راجہ بہادر کے حکم سے

ان کا تبادلہ حیدرآباد میں ہوا۔ گلبرگہ میں الوداعی جلسے ہوئے لوگوں نے نظمیں پڑھیں مگر ان سب میں نواب شہید یار جنگ بہادر کی نظم مجھے بہت پسند آئی وہ حقیقت میں ان کے اصلی گیر کمیر اور کام لوگوں کے صحیح جذبات کا آئینہ دار ہے دو چار شعر مجھے زب بھی یاد ہیں آپ بھی سنئے ۵

اے خلق کے نمونے سجاد نام تیرا

ہر شخص کے ہے دل میں پیار مقام تیرا

ہر دم ہے مسکراتا فقرے سننے سنانا

حقہ فقط تھا بے شک وہ لاکھ نام تیرا

جبار ظالموں پرستار خالیوں کا

بے شک معین تیرا عبدالسلام تیرا

اللہ کے حوالے اے بندہ جانے والے

ہے حالِ دل میں کندہ سجاد نام تیرا

گلبرگہ سے یہ حیدرآباد گورنمنٹ ہائی اسکول چادرگھاٹ پر آئے

اور سٹر پکٹھال سے انھوں نے جائزہ حاصل کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جو ایک انگریز

کا جانشین ہندوستان ہوا اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں پیرس ٹریننگ کالج کے

پر وینر مقرر ہوئے۔ کسی کا شعر ہے ۵

کریں کیا سیر کعبہ کا جن میں ہو سببت خسانہ

یہاں تو مور تمیق ہیں اور وہاں اللہ ہی اللہ ہے

اس وقت ٹریننگ کالج کا بھی صرف نام ہی نام تھا باہر تو ٹیپ ٹاپ

تھی اور دھڑ رام ہی رام تھا۔ سجاد مرزا صاحب اب تک تو انتظامی معاملات

اور علم مضمونوں کو پورا کرنے کیلئے منہمک رہتے تھے مگر اب یہاں اور

اور زیادہ علمی اور ذہنی کوششیں کرنی پڑی سب سے پہلے تو انھوں نے

ٹرنینگ کالجوں کی تعلیم کی پھر منصوبے بنائے اور انہیں پورا کرتے کیلئے آلات و اسباب اور ایسے قابل افراد فراہم کیے جن میں کام کرنے کی صلاحیت اور قابلیت تھی اس کے بعد ایم ایڈ کی کلاس کھولی اور ساتھ ہی ان نواتین کے ٹرنینگ کالج بھی انتظام کیا جو بالے کی تعلیم حاصل کر کے ٹرنینگ سے محروم رہ جاتے تھے اب جو نظر اٹھائے تو نصاب ادھورا اور ناقص پایا اسے مکمل کرنے کیلئے انگریزی زبان کے معیاری اور فنی ترجمہ کرنے کی ایک اسکیم بنائی اور ساتھ ہی ساتھ سلیس زبان میں اصطلاحات کے ترجمہ کرنے کی ایک الگ یو جاتیار کی اور پھر ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔

سجاد مرزا صاحب کا مطالعہ تھا نہایت وسیع وہ ہمیشہ کسی نہ کسی تحقیقی کام میں ڈوبے رہتے ہیں ان کی کیفیت کا ایک مشق کی سی ہے جو ہر وقت چلتی رہتی ہے اور کبھی نہیں رکتی چنانچہ تھوڑی سی مدت میں انہوں نے خود بھی چند معیاری کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی نگرانی میں کالج کے استادوں سے تقریباً چالیس معیاری کتابوں کا ترجمہ کروا کر سلسلہ تراجم عثمانیہ ٹرنینگ کالج کے عنوان سے چند ہی سال میں زور و طبعاً سے آراستہ و پیراستہ کر کے شائع کر دیا اور ساتھ ساتھ فن تعلیم کی اصلاحات بھی چھاپ کر شائع کر دی گئیں۔ یہ اردو میں ایک ایسا بیش بہا اضافہ ہے۔ جواب تک کسی دوسری ہندوستانی دلی زبان کو نصیب نہیں ہوا۔ چنانچہ اس کی توصیف و تعریف میں ایسے ایسے ماہر اور ارباب علم و فضل و طب اللسان ہیں جن کی تصنیفی علمی دنیا میں سند مان جاتی ہیں۔ جیسا کہ اساتذہ اردو فنی تعلیم کے ذخیروں کی تلاش میں رہیں گے ان کا یہ کارنامہ زندہ رہے گا۔ اور کتابوں کے دیباچے پڑھنے والوں کو ان کے علمی جد و جہد کا کہا نیاں سناتے رہیں گے ٹرنینگ کالج کی پرنسپل کے علاوہ یہ پہلے چیف انلیکٹر آف نارمل

اسکولس بھی ان ہی کے تحت میں تھے ان کا حالت بھی ابتدائی تھی ان اسکولوں کو نارمل حالت میں لانے کیلئے بڑی جدوجہد کرنی پڑی از سر نو ان کی تنظیم کی باضابطہ ان کا نصاب تیار کیا اور ان میں ملکی زبانوں کی تدریس کا ایسے وقت انتظام کیا جبکہ ان زبانوں پر کافی توجہ نہیں دی جا رہی تھی اس سلسلے میں اساتذہ کی ٹریننگ پر جو رپورٹ لکھی ہے وہ ماسٹر ہیں ان کاموں کے علاوہ دوسرے اور کئی علمی کام بھی وہ لے رکھے تھے تعلیم بالغان سے انہیں خاص دلچسپی ہے اس کے متعلق انہوں نے حکومت کے پاس جو رپورٹ پیش کی ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے اور پانچ سال کی مدت میں نانا نواندگی کے چمک مرض کو نیست و نابود کرنے کیلئے جو منصوبے رکھے ہیں۔ وہ تباہی علی ہیں اس سلسلے میں سید مرزا صاحب کی رہبری میں تعلیم کے واسطے جو چارلس ماڈل اور نقشے تیار ہوئے ان کی مانگ باہر بھی ہوتی تھی اور وہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں علمی کالیشن اور تعلیمی مرکزوں میں لٹکتے ہوئے نظر آتے تھے دوسرے کچھ پڑھ ماہرین کو تو چھوڑ دو خود مذہبی جیسے انارٹی اور عائلی سے انہوں نے اپنی نگرانی میں کئی چارٹس اور فنی کتابیں تیار کرائی جو کوآکسفورڈ پریس ادبیات اردو وغیرہ نے ہاتھوں ہاتھ لیں اور کافی رقم خرچ کر کے شایع کیں۔ سب سے پہلے تو مینو سالانہ تصنیف کا ترجمہ ہمارا ہندوستان کے عنوان سے کرایا جس کی خوبی اور نفاست حزب الملک ہے اب تک اسی کے ایڈیشن چھپتے چلے جا رہے ہیں اور تعریفوں کا تانا باندا ہوا ہے۔ پھر رفیق اردو اور زرین حکایات کے نام سے مثنوی مولانا روم کے قصیدوں کا ترجمہ کرایا جس کے متعلق ادبیات اردو کے مقدمہ ڈاکٹر زور کھنجر لکھتے ہیں۔

مولوی عظمت اللہ بیگ صاحب نے بچوں کے نام کے لئے ایک خاطر اس مشنوی کا مطالعہ کیا تو انہیں ایسی ایسی کہانیاں اور کام کہیں پاتھے آئیں کہ ادب اطفال کا بڑے سے بڑا ماہر ششدر رہ جائے اور دینا کو مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج کامرہوں منت ہونا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ پوری کی پوری کتاب ان کی دلچسپی اور بہت افزائی کا نتیجہ ہے۔

عرض یہ کہ بیسیوں کتابیں لکھوا دی گئیں، بیسیوں چھپیں اور بیسیوں اب تک نظروں سے چھپی ہوئی ہیں۔ دیکھیں ان کا کب نمبر آتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تین رسالے جاری کیے تھے سب سے اول

رسالہ ”المعلم“ ہے جو ۱۹۲۴ء میں مولوی محمد حسین صاحب جعفری نے ان کی شرکت سے جاری کیا تھا اس کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ حیدر آباد کے پاتھ کے بنے ہوئے کاغذ پر بڑی آب و تاب سے ہر ماہ نکلتا تھا اس میں غریزہ بالوں کے ادب جو اہر رہنے سے اردو میں منتقل کیے جاتے تھے جدید تعلیمی خیالات کی اشاعت کی جاتی تھی۔ نئے نئے الفاظ اور نئی نئی ترکیبیں تراشی جاتی تھیں۔ بے شک اردو لغت اور تدریسیات کے اصطلاحات کی سلسلہ جنہاں اسی کے بدولت ہوں اور اردو رسم الخط اور ٹائپ کے بنیادی اقتدائی منازل کے ذریعہ منظر عام پر آئے ہیں اس میں اساتذہ کو اپنے خیالات کو آزادی سے ظاہر کرنے کا موقع دیا جاتا تھا اور مطبوعات پر بے لاگ تبصرے ہوتے گئے۔

دوسرا ایک پندرہ روزہ پرچہ ۱۹۳۷ء میں ”آپا“ کے نام سے بچوں کیلئے جاری کیا تھا اس کے سب سے جو شیڈلے کارکن ملا فخر الحسن صاحب اور شیخ سمیع اللہ صاحب آرٹسٹ تھے جو آپا کے ضد و خال اور نوک پلکا بنانے میں مصروف رہتے تھے ”آپا“ کھیل میں بچوں کو تعلیم دیتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے قصے

اچھی اچھی کہانیاں اور دلچسپ نظمیں سناتی تھیں یہ اپنی نوعیت کا پہلا پرچہ تھا جو ایک ساتھ تلنگی اور مرہٹی زبانوں میں نکلتا تھا اور بچے بوڑھے مدت ختم ہونے سے پہلے آنکھیں پھاڑے اس کا انتظار کرتے رہتے تھے خدا معلوم کیا واقعات پیش آئے کہ پرچہ بند ہو گیا، ملا صاحب نے اس کا، مرثیہ دھر گھٹیا دوچار شعر نیٹے سے

آن تھی نہ بھر پور جوانی نہ بڑھاپا
افسوس تھے کھا گیا غیروں کا جلاپا
جب ہم نے خبر پائی، ہمیں چھوڑ چلی ہو
چھاتی پہ ہمارے ہوائی بم کا دھماکا
ہے شیخ کی مجلس میں صبح شام ترا ذکر
سجاد تری یاد میں رہتا ہے تر پتا
ہے میری آپا
ہے میری آپا
منہ موڑ چلی ہو
ہے میری آپا
ملا کو تری فکر
ہے میری آپا

تیسرا جیت کار سالہ تھا جو دوسری عالمیگر جنگ میں فوجوں کیلئے جاری کیا گیا تھا اس میں شروع سے آخر تک بیٹے ہسنے کا باقی ہوتا تھا اور، تھکے ماندے یا زخمی سپاہیوں کیلئے ایسا لیٹر بچہ فراہم کیا جاتا تھا کہ ان کا پٹر مردگی کو دور کرے اور ان میں سکون کا ہر دورہ ادرے ہیں اسکا زمانہ یہ ۱۹۴۹ء میں سجاد مرزا صاحب نامک ناظم تعلیمات مقرر ہوئے یہ ضرر صاحب نے فی البدیہہ تاریخ پر لکھا احباب ہو یا اقربا افسر ہوں یا زہر دہست مرزدہ علما دیا سب کا مبارکباد نے میر نے یہ مہر ع کیا

سجاد نے "جیت" کے ایڈیٹر صاحب کو جو ہوش آیا تو انھوں نے بھی اُلٹی سیدھی ایک تاریخ کہہ دکا وہ بھی سن لیجئے

جیت کے دفتر میں پہنچی یک بہ یک ہم کو خبر
جس کو سن کر ہم خوشی سے کیا کہیں کیا ہو گئے

وہ جٹے رہے علی شغلوں میں رات دن
دقہ ران کاموں کو یادہ سراپا ہو گئے

بیک اردو کیلئے لفظ اس ترکیب سے
ایسے دہائیے کہ اردو کا خلاصہ ہو گئے

بیٹھے بیٹھے کر دیا ایجاد دکان خط
سادگی پر جس کی سب خطا پرشید ہو گئے

فصلی سنہ میں مہرغ تار یخ ہمہ جوہر
اس میں شعبہ کے عدد لیکن زیادہ ہو گئے

مہرغ تار یخ جب مل کر پڑھا دو چار
عمیوی سنہ کے عدد دیکھ اس میں پیدا ہو گئے

مختصر یہ کہ بڑی تکرار سے یہ مہرغ بنا
نائب ناظم سینئر سجاد مرزا ہو گئے

ان کی شخصیت میں ہلاکی جاذبیت اور کشش ہے ایک مرتبہ ملنے کے
بعد غیر ممکن ہے کہ دوبارہ ملنے کی خواہش نہ ہو، گفتگو کا بھی خاص ڈھب ہے
تلفع اور بناوٹ نام کو انہیں جب بات چیت کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ،
خوش بیانی کا دریا اُمنڈ رہا ہے اس میں کہیں کہیں ظرافت اور خوش مذاقی کا
چاشنی بھی ہوتا ہے جو ہنسی کے رنگ بھٹوں کو گدگداتی رہتا ہے اور
مردہ دلوں کو گدگداتی رہی ہے۔ اور پھر مردہ دلوں کو شگفتہ کرتا رہتی
ہے۔ ان کی باتیں سن کر ذہن اور جذبات میں جلا ہوتا ہے اور جب محفل سے
اُٹھو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں بھی کسی چیز کا اضافہ ہو گیا ہے ان کا،
دیراندہ چھوٹے بڑے جوان بوڑھے استاد شاگرد اور عالم و جاہل سب
کیلئے کھل رہا ہے ہر شخص بغیر کسی روک ٹوک کے آتا ہے جاتا ہے اور شہنشاہ

گفتند و ہر خواستند کے ٹائم ٹیبل پر عمل ہوتا رہا ہے۔

میں عموماً ہفتہ بھٹی کے دن ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب سے ملتا ہوا کوئی گیارہ بارہ بجے کے قریب ان کے پاس جاتا ہوں تو اس وقت بھی اُن کا گھر لوگوں سے بھرا ہوا پاتا ہوں اُن میں ہر مذہب و ملت کے لوگ نظر آتے ہیں۔ تعلیمات کے لوگوں کو تو چھوڑ دیجئے ایسے ایسے لوگ دکھائی دیتے ہیں جن کو تعلیمات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے کسی کام سرع ہے وہ خط کامغنون تار لیتے ہیں نفاذ دیکھ کر

بس یہی کیفیت ان کی بھی ہے صورت دیکھتے ہی تار جاتے ہیں۔ کم کون کس کا دن آیا ہے کسی سے چار کے آگے بات کرتے ہیں۔ کسی کو نزدیک بلا کر کانا بھوسی کر لیتے اور کسی کو ڈرائنگ روم میں علیحدہ بیٹھا کر ملاقات کا موقع دیتے ہیں۔ اور جہاں تک جلد فکری ہوتا ہے دماغ درمے قدمے سننے اس کی جائزہ امداد کر کے خدا حافظ کہہ دیتے ہیں اور کسی کو کالوں کو کان خبر نہیں ہوتا کہ فقیر کی بھولی میں کیا ڈالتا ہے اور کیا نکالتا ہے ذرا معاف کیجئے میں اپنے رد میں غلط نہ کہہ گیا۔ ضرب المثل میں تو قدم کا لفظ ضرور ہے مگر یہاں آکر ذرا لڑکھڑا جاتا ہے اس لیے کہ وہ بہت دیکھ کر یہاں سے قدم اٹھاتے ہیں۔ عام مکتبوں میں شاذ۔ نادر ہی شریک ہوتے ہیں اور سبلسی سے بہت گھبراتے ہیں۔ مگر دماغ درمے اور سننے تو سولہ آنے برابر ہے اس لیے کہ ذاتی طور پر ان کا دستِ سخا مستحق اور نادر طلباء کا امداد کیلئے ہر وقت کھلا رہتا ہے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ برا بکواسلوک کرتے رہتے ہیں اور بکھنے پڑھنے والوں کا بے دھڑک امداد کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات دوسروں کی جبین گرم کر کے خود خال ہاتھ رہ جاتے ہیں۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان کا دربار ہر وقت گرم رہتا ہے

ایک حلقہ ایسا ہی ہے۔ جس میں لکھنے پر ہنسنے والے کاروباری یا ماہر فن بھی
 ہیں۔ ان میں کوئی ترجمہ کرتا ہے کوئی لکھتا ہے کوئی تھیف و تالیف
 میں مشورہ لیتا ہے کوئی حرفوں کی تراش و تراش میں مصروف رہتا ہے کوئی
 ریختے اور میسر کس کا ہے اور کوئی بیک خط کیلئے حرفوں کی کششوں اور دُموں کا
 قطع و سیریز آتارہا ہے یہ سب کے سب اپنے اپنے کاموں میں جتے رہتے ہیں اور
 شہید کی ٹکھیوں کی طرح کام سے لگے رہتے ہیں۔ سجاد مرزا صاحب نے ان سے
 بڑے بڑے کام لیے ہیں ان میں سب سے پہلا کارنامہ تو بے شک ہندوستانی
 کا ہے یعنی جس طرح بے شک انگلی کے ماہروں نے انگریزی زبان کے کئی لاکھ
 لفظوں میں سے (۲۰۰) ایسے الفاظ چن لیے ہیں جو عام باتوں پر حاوی ہیں بس
 اسی طرح انھوں نے بھی شکستہ میں ان ہی استادوں کی مدد سے اردو ہندی
 کے ہزاروں لفظوں کے خزانے سے ایک ہزار لفظ ایسے چن لیے ہیں جنہیں
 اگر ٹھیک طور پر کام میں لایا جائے تو ان سے یہ مطلب ظاہر کیا جاسکتا ہے
 آپ فرمائیں گے کہ جب اردو یا ہندی موجود ہے تو پھر بے شک ہندوستان
 زبانوں کا گلدستہ ہے کیوں گلی چینی گئی ہے تو بات یہ ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ
 جہاں ہندوستان میں سینکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں اور اردو ہندی میں جو
 فرق ہوتا ہے بار بار ہے۔ اس خلیج کو باٹھنے کیلئے کام دے اور ہندوستانی
 کی ایک قومیت کا نشان یہی ہو اور دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہندوستانی
 نہ جاننے والے لوگوں کو کم سے کم دنوں میں آنا لکھنا پڑھنا اور بولنا
 سکھایا جائے کہ وہ اپنا روزمرہ کی زندگی کی باتیں کر سکیں کچھ پڑھ سکیں
 اور انھیں آگے چلا کر اردو ہندی لٹریچر کی تعلیم پائی ہو تو آسانی سے
 حاصل کر سکیں۔

دوسرا کارنامہ بے شک خط کی ایجاد ہے جس کو وہ خود اپنا زندگی کا

ایک کارنامہ سمجھتے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ اردو کا کوئی ایسا خط نہیں ہے پہلے اسے لوگ دیوناگری میں لکھتے تھے پھر نعلیق میں لکھنے لگے اور انگریزی آئے تو وہ اردو میں رسم خط استعمال کرنے لگے عربوں نے عربی زبان کیلئے کوئی نسخہ نکالا اور رنارغ وغیرہ ایجاد کیا فارسی زبان کیلئے یہ خط غیر موزوں ہے۔ ایرانیوں نے اپنی دیرھ انیٹ کی مسجد الگ بنالی اور فارسی زبان کیلئے، نعلیق اور شکستہ خط ایجاد کیا۔ ترکوں کو یہ سب خط اپنی زبان کیلئے بے عمل ثابت ہوئے تو انھوں نے ایرانی رسم خط ایجاد کیا اور جب اس سے بھی کام نہ چلا تو لاہینی خط اختیار کر لیا جب یہ خط ہندوستان میں آئے تو لوگوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایرانی رسم خط میں اردو کی کتابت شروع کر دی مگر تمام خط غیر زبان دان لوگوں اور بچوں کیلئے غیر دلچسپ و مشکل اور مشکل ہیں۔ ان کی مختلف نشیں بوڑ اور شوشے پر نیشا لانہ صحت اور نفع اوقات کا باعث ہوتے ہیں اور پھر یہ خط میں طباعت کے جدید ترین اصولوں کے مطابق میکانیکی ضروریات پوری نہیں کرتے۔ اسلئے بچوں کی نفسیات کو مقدم رکھتے ہوئے انھوں نے اردو کیلئے ایک ایسا خط ایجاد کیا جو سادہ سہل اور خوش وضع ہونے کے علاوہ اس میں یکسانیت روانی اور آسانی ہے حروف کی شکل نہیں ہوتے کسی ایک ہی رشتی ہے بوڑ کم ہیں۔ ٹائیپ آسانی سے بن سکتا ہے اور اب تک جو خط نکلے ہیں۔ ان تک آسانی کے ساتھ آسانی ہو سکتی ہے یہ خط چلا اور خوب چلا بچوں نے پڑھا پوڑھوں نے پڑھا۔ خوشنویسوں نے میدان قلم میں جگہ دی۔ ٹائیپ سازوں نے نوہے کے سہ بچوں میں ڈھالا اور فن کاروں نے موقع اور عمل سے اس کا، استعمال کی شروع کر دیا۔ تیسرا کارنامہ بھی ٹائیپ ہے جو نوا ایجاد بے سبک خط کا نتیجہ ہے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے چینیوں نے ٹائیپ ایجاد کیا

مگر ان کے حرفوں کو جوڑ توڑ اور کلچر اس قدر تھے کہ وہ چین بھول گئے اور اپنا ایجاد کیا ہوا ٹائپ طاق بنیاد پر رکھ کر بھول گئے اس کے بعد گٹنبرگ نے جرمنی میں اور پندرہویں صدی کے آخر میں کیسکس نے انگلستان میں ٹائپ ایجاد کیا اور طباعتی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اس وقت دنیا کے تمام مہذب زبانوں کے ٹائپ ہیں مگر نہیں ہے توہرن میچاری اردو کا اس چیز کو دیکھ کر سجاد مرزا صاحب پرانے اصولوں کو سامنے رکھ کر خط میں بنیادی تبدیلیاں لایا اور اس سے ایک حرکت پذیر ٹائپ بنایا جو روٹ ٹائپ کی طرح فل باڈی ہے۔ جوڈ کم ہیں۔ اور اس کا کمپوزنگ اور تقسیم میں کفایت اور سہولت ہوتی ہے دوسرے ٹائپ کے مقابلے میں گورنمنٹ آف انڈیا سے اس کا سرٹیفکٹ بھی حاصل کر لیا گیا ہے اور اس وقت بعض پرچوں میں اس سے طباعت بھی کی جاتی رہی ہے۔

سجاد مرزا صاحب نایب ناظم تعلیمات کے عہدہ پر رہے۔ بیدار لوگ خواب دیکھ رہے تھے کہ بہت جلد ناظم ہو جائیں گے۔ سب کے سب بڑے جوش و خروش کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ تعلیمی اسکیمیں تیار ہو رہی تھیں اور کتابوں پر کتابیں نکلی جا رہی تھیں مگر تماشا دیکھئے کہ اس وقت معتمدی تعلیمات کیلئے حکومت کی نظر غلط کامران اور کارفرما کی تلاش میں تھیں ان پر نظر پڑا اور فوراً ان کا وہاں تعین کر دیا گیا اور یہ نظام کی کرسی پر چھلانگ مارتے ہوئے ایجوکیشنل سکرٹری بن گئے۔ مولو کا عزیز مرزا صاحب ۱۹۰۸ء میں معتمد حکومت تھے اور فرزند پورے (۱۹۰۹ء) سال بعد ۱۹۰۹ء میں اپنے والد کے عہدہ پر جا پہنچا چلو حق بہ حق دار کی مثل صادق آلہ اور ضعیف معنوں میں وہ اپنے والد کے جانشین ثابت

ہوئے حکیم کھتر صاحب نے اپنے حکیمانہ انداز میں تاریخ لکھی۔ جس کا ہر مصرع
 مصرعہ کی ڈال چہ سب کا کو ملے ہے کرسی جو تھی بدر کبر ^{انھوں نے کہا}
 کوئی نہ آیا اس میں فہمیلی میں لکھتے بیٹھیں۔ تاریخ ہم جو کھتر نکلا زبان سے یکدم
 خلف رشید نامی ۲۸ سال تک مسلسل سلسلہ ملازمت میں منسلک رہے زمانہ کے
 عروج و زوال دیکھتے مغلانی دور دیکھا۔ انگریزی حکومت دیکھی، جمہوری
 سلطنت دیکھی طوفانی دور دیکھا۔ تاریک ظلمات چھائیں بارل منڈلائے،
 گھٹاؤ پگھلائے آئیں بگولے اٹھے طوفان خیر ہوائیں چلیں بڑے سے
 بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ ہر قوم، ہر جماعت
 اور ہر مذہب کے لوگوں کے ساتھ شکر ہو کر رہے۔ مگر امن و تھمیلی نے
 دھبہ اور طبعیت نے کوئی اثر قبول نہ کیا ان کا مثال ایک قازک سیا
 ہے جو پانی میں رہتی ہے طوفان اور موجوں سے کھلتی ہے پانی میں غوطے
 پر غوطے مارتی ہے اور جب اڑتی ہے تو پروں پر پانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اخبار سے یادست سے ماخوذ کیا گیا

تأثرات

ڈاکٹر زینت ساجدہ سابق صدر شجہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
عصمت اللہ بیگ بڑے خوش باش، خوش فکر اور خوش گفتار آدمی تھے
اور یہی رنگ ان کی نظم اور نثر میں بھلکتا ہے وہ دلا کے اس گھرانے سے تعلق
رکھتے تھے جس کو غالب اور مومن سے نسبت تھی اور جس نے خواجہ امان مترجم ہوتا
خیال کو جنم دیا تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ان کے چچا زاد بھائی تھے جن کا طرافت
نے اردو میں ایک نیا رنگ پیدا کیا۔

عصمت اللہ بیگ بھوپال میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے والد ڈاکٹر تھے لیکن صغر
سنی ہی میں دہلی چلے گئے اور وہاں سے حیدرآباد پہنچے۔ ابتداء میں سررشتہ تعمیرات
سے وابستہ تھے لیکن بعد میں نواب مسعود جنگ کا سفارش پر دارالطبع میں منتقل
ہو گئے تھے۔ انھیں نجوم، رمل، جفر اور مصوری سے گہرا نگاڑ تھا۔ نجوم پر تو
آسمان کے بھید کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

عصمت مرحوم شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ شاعری میں وہ اکبر اور حالی سے
متاثر تھے اور طنز و طرافت سے اصلاح کا کام لیتے تھے۔ حکیم معشوق علی خاں کی
صحبت میں ضلع جگت، رعایت لفظی، تعذبات، تکلفات کا چسکا لگ گیا تھا۔
جو ان سے کبھی نہ چھٹا۔ ان کی تصانیف نظم و نثر میں انوار، شمس، حکیم
معشوق علی خاں جوہر، کاک ٹیل، زرین حیات، سیلاب کی کہانیاں،

دا والائی بھمکر، حیات سعدی وغیرہ قابل ذکر ہیں انھیں ترجمہ کا بھی اچھا علم تھا غلط
اور چار ہندوستانی اسکا بہترین ثبوت ہیں ان کے تراجم مضامین میں جوہر اور حکیم بی کا معب ہوتا مشہور ہے
حیدرآباد کے ادیب مطبوعہ آفرین پریس پریشاس ہیمہ ایکڈمی (۱۹۵۸ء)

قاشرات

بڑی مسرت کی بات ہے کہ ہمارے شہر حیدرآباد کی ایک معزز ہستی
نواب میر طاہر علی خان صاحب کی زیر سرپرستی ہمارے ملک کے مایہ ناز مزاحیہ
ادیب میرزا عصمت اللہ بیگ کے چند منتخب شگفتہ مضامین کا ایک مجموعہ "منازع
ظرافت" کے نام سے کتاب کی صورت میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر
منظر عام پر پیش ہے۔

اردو ادب میں مزاح اور طنز کا عنصر آٹھ میں ایک کے برابر ہے۔
یہ حقیقت ناقابل انکار اور قابل ذکر ہے کہ مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب نے
اپنی ساری عمر مزاحیہ ادب کی تخلیق میں گزار دی۔ ان کا نام اردو ادب میں بہت
ارفع و اعلیٰ ہے، انھوں نے جو بیش بہا سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے اس کی اشاعت
و طباعت کی ذمہ داری عصمت نے سنبھال لی ہے۔ حیدرآباد کے سرسبز
آئینہ کہ اس ذمہ داری سے عہدہ رہا ہونے کی شراور سعی سے گئی اور اہل ذوق و ذائقہ
اس کتاب "منازع ظرافت" کو شوق اور جذبہ سے پڑھیں گے اور ملک کے ایک
عظیم ادیب کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کا یہی ایک واحد طریقہ ہے۔

ایسے اے سہیل کور
قائد کانگریس

فیروز گاندھی نگر
آصف نگر حیدرآباد

حرف آخر

مرزا عصمت اللہ بیگ نے دھلی کے علمی گھرانے میں آنکھیں کھول کر وہ اردو تہذیب اور ہندوستانی کلچر کا عطر مجموعہ تھے۔ اُن کی شخصیت اور فکر و فن میں شمال اور دکن کا خوشگوار امتزاج تھا وہ ہندوستانی کے منتخب باکمال اور قادر الکلام ادیب، شاعر، معلم انسانیت اور طنز و مزاح کے شگفتہ کار مصنف اور فکاہیم نگار تھے۔ درجنوں کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ رسائل جا کئے، بچوں اور بالغوں کے لئے صالح ادب کی تخلیق کی۔

”متاعِ طرائف“، مرزا عصمت اللہ بیگ کی منتخب نثری تحریروں کا اہم گلدستہ ہے جسے پڑھ کر مرزا صاحب کی ذہانت و فطانت، شگفتگی، طبع اور اردو کا نیرقومی شعور سے اُن کی گہری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے طر
زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے

عصمت میموریل پیپل کیشنز کمیٹی نے حضرت عصمت کی تین کتابیں شائع کر کے عصمت شناسی کا ثبوت دیا جن میں ”انوارِ تبسم“، ”انوارِ طرائف“ اور ”گنجینہ“ شامل ہیں۔ چوتھی کتاب ”متاعِ طرائف“ باذوق اصحاب کی جناب میں پیش ہے حضرت عصمت کی شگفتہ اور سدا بہار تحریروں کا یہ مجموعہ یقیناً ہے ادبی دنیا سے خراج حاصل کرے گا۔

ایوانِ اردو پنجہ گٹ روڈ

حیدرآباد۔ ۵۰۰۸۲

وقتِ خلیل

۲۸ / فروری ۱۹۸۵ء

اظہار تشکر

مخلص کرم فرما جناب چند سری واستوا صاحب سکرپٹری ،
گور اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کا خصوصی سے شکر یہ ادا کرنا
وہی سمجھتے ہیں جنہوں نے دہے اور سچنے اس کتاب « متاع ظرافت ،
مشاعت میں بڑا تعاون فرمایا ، ورنہ موصوف کے پر خلوص تعاون
بغیر اس کتاب کی اشاعت ممکن نہ ہوتی ۔

صدر نشیں عصمت میموریل پبلیکیشن کمپنی ، حیدر آباد



Shri Nawab Taher Ali Khan

CHAIRMAN

A. P. Minorities Congress



Shri Khaja Mohiuddin

CHAIRMAN

Congress for National Solidarity Hyderabad



Shri Mirza Ismatullah Baig
HUMORIST WRITER



سوانح حیات میرزا عصمت اللہ بیگ

از : میرزا صبغتہ اللہ بیگ (فکر حیدر آبادی)
فائرڈر سکرٹری : عصمت میموریل پبلیکیشنز کبٹی حیدر آباد
میرزا عصمت اللہ بیگ، دہلی کے ایک شریف اور
معزز ادبی اور علمی گھرانے میں ۳۰ مارچ ۱۸۹۶ء میں
پیدا ہوئے، میرزا غالب دہلوی سے رشتہ داری تھی
میر ہومن خان ہومن سے قرابت داری تھی، خواجہ امان
مترجم ہوسنان خیال سے نسبت تھی۔ میرزا فرحت اللہ بیگ
دہلوی کے چچا زاد بھائی تھے، جنکی ظرافت نے اردو
ادب میں ایک نیا رنگ اور انداز پیدا کیا۔

عصمت اللہ بیگ صغیر سینی ہی سے حیدر آباد پہونچے
نواب مسعود جنک بہادر کی تجویز پر دارالترجمہ جامعہ

عشمانیہ سے وابستہ ہو گئے۔ عصمت اللہ بیگ، شاعر بھی تھے
 نثر نگار بھی تھے، شاعری میں حضرت اکبر الہ آبادی اور
 مولانا الطاف حسین حالی سے بیحد متاثر تھے طہیز و ظرافت
 سے قومی اصلاح کا کام لیتے تھے، کلیم معشوق علی خاں
 جوہر کی صحبت میں ضائع جنگ رعایت لفظی، تصنیفات و
 تکلفات کا چسکا لگ گیا تھا۔ عصمت اللہ بیگ کی تصانیف میں
 رفیق اردو داں ہمارا ہندوستان، زرین حکایات، حکایات
 جامی و سعدی، فاقہ کیوں؟ آسمان کے بھید، کاک ٹیل
 کافی مقبول ہیں۔ عصمت میہوریل پبلیشر کمپنی کی تشکیل
 کے بعد سے آج تک انوار تبسم، انوار ظرافت، ہمارا پنج سالہ
 منصوبہ، گنجینہ جوہر اور اب متاع ظرافت کے نام سے
 عصمت اللہ بیگ کے منتخب مکلفہ اور سدا بہار نگارشات
 کا ایک مجموعہ زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے جو یقین
 ہے کہ اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کرے گا۔

عصمت اللہ بیگ حیدر آباد آکر یہیں ملازم ہوئے،
 یہیں شادی ہوئی، یہیں پنشن ہوئی اور یہیں پر ۲۸ مارچ
 ۱۹۵۴ء میں انتقال کیا اور یہیں میرزا فرحت اللہ بیگ کے
 قریب "الہی چمن" کی خاموش فضاء میں آرام سے سو رہے ہیں۔

متنازعہ طرافت

مضامین

مرزا عصمت اللہ بیگ محرم

ترتیب

وفاتِ خلیفہ